شذرات		
تقلید اور اجتہاد	منظور الحسن	۲
قرآنیات		
آل عمران (۳: ۱۹۰۔۲۰۰)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی		
ایک شہید کے اجر سے متعلق روایت	معز امجد	۱۱
ایمان کی شاخیں	طالب محسن	۱۳
سمندر کا مردار حلال اور پانی پاک ہے	ساجد حمید	۱۸
دین و دانش		
ایمانیات (۶)	جاوید احمد غامدی	۲۵
نقطۂ نظر		
چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۲)	پروفیسر خورشید عالم	۲۹
سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی ناکامی	الطاف احمد اعظمی	۴۰
سیر و سوانح		
بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۳)	خالد مسعود	۵۱
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۴)	محمد وسیم اختر مفتی	۵۸
یسئلون		
متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی / معظم صفدر	۶۷

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

تقلید اور اجتہاد

www.javedahmadghamidi.com

موجودہ زمانے میں مسلمان علما کی غالب اکثریت تقلید جامد کو بطور اصول اختیار کیے ہوئے ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ احکام دینیہ کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے قدیم علما کا کام ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ان کے کام کی تفہیم اور شرح و وضاحت تو ہو سکتی ہے، مگر اس پر نظر ثانی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دور اول کے فقہا نے جو اصول و قوانین مرتب کیے ہیں، وہ تغیرات زمانہ کے باوجود قابل عمل ہیں۔ اس ضمن میں تحقیق و اجتہاد کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس بات کا اب کوئی امکان ہے کہ کوئی شخص مجتہد کے منصب جلیلہ پر فائز ہو سکے۔ اس نقطۂ نظر اور اس پر اصرار کے باوصف حقیقت یہ ہے کہ یہ اہل علم فکر اسلامی کے بارے میں پیدا ہونے والے متعدد شکوک و شبہات رفع کرنے اور نفاذ شریعت کے حوالے سے بعض سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک طرف ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو ان علما کے زیر اثر تقلید جامد کے اسیر ہیں اور دوسری طرف وہ نسل پروان چڑھ رہی ہے جو دعمل کے طور پر اسلام کو ایک قصۂ پارینہ قرار دے کر جدید فلاسفہ سے کسب فیض کرنے کے لیے بے تاب ہے۔

ہمارے اہل دانش علما کے اس رویے کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تقریر بالعموم یہ ہوتی ہے کہ علماے امت صدیوں سے تقلید کے طریقے پر گام زن ہیں۔ وہ ماضی بعید کے اہل علم کی تحقیقات اور آرا ہی کو حرف آخر سمجھتے اور قرآن و سنت پر از سر نو غور کرنے کے خلاف ہیں۔ مگر موجودہ زمانے میں تمدن کے ارتقا نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں، وہ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے قدیم علما ہی کی دینی توضیحات کو اختیار کرنے پر مصر ہیں۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اجتہاد کے بند دروازے کو کھولا جائے اور اہل علم دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر و تشریح کریں۔

اس تصور کے تناظر میں یہ سوالات عام طور پر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ کیا قرآن وسنت کے احکام میں مرور زمانہ کے ساتھ ترمیم وتغیر ہوسکتا ہے، کیا ان معاملات میں بھی اجتہاد ہوسکتا ہے جن میں قرآن وسنت نے نہایت واضح احکام دیے ہیں، کیا قرآن وسنت کی شرح و وضاحت کے بارے میں ہم علما کی تحقیقات کو اجتہاد ہی سے تعبیر کریں گے؟ ان سوالات کے حوالے سے یہ مناسب ہے کہ یہاں مختصر طور پر اجتہاد کا مفہوم اور اس کا دائرۂ کار بیان کر دیا جائے۔

اجتہاد کا لغوی مفہوم کسی کام کو پوری سعی و جہد کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جس معاملے میں قرآن وسنت خاموش ہیں، اس میں نہایت غور وخوض کر کے دین کے منشا کو پانے کی جدوجہد کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے منسوب روایات کی روشنی میں اجتہاد کا دائرۂ کار حسب ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اجتہاد کا تعلق انھی معاملات سے ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے دین وشریعت سے متعلق ہیں۔

۲۔ انسانوں کو انفرادی یا اجتماعی حوالے سے جب بھی قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو انھیں چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن وسنت سے رجوع کریں۔

۳۔ جن معاملات میں قرآن وسنت کی رہنمائی موجود ہے، ان میں قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔

۴۔ جن معاملات میں قرآن وسنت خاموش ہیں، ان میں انسانوں کو چاہیے کہ اپنی عقل و بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے آرا قائم کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ان نکات کی بنا پر یہ بات بطور اصول بیان کی جاسکتی ہے کہ شریعت محل اجتہاد نہیں ہے، بلکہ محل اتباع ہے۔ محل اجتہاد صرف وہی امور ہیں جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ چنانچہ اجتہادی قانون سازی کرتے ہوئے، مثال کے طور پر عبادات کے باب میں، یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ تمدن کی تبدیلی کی وجہ سے اب نماز فجر طلوع آفتاب کے بعد پڑھی جائے گی؛ معیشت کے دائرے میں یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ اب زکوٰۃ ڈھائی فی صد سے زیادہ ہو گی؛ سزاؤں کے ضمن میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ مثلاً قتل کے بدلے میں قتل کے بجائے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔ گویا شریعت کے دائرے میں علما اور محققین کا کام صرف اور صرف یہی ہے کہ احکام کے مفہوم و مدعا کو اپنے علم و استدلال کے ذریعے سے متعین کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ان کے لیے کسی تغیر وتبدل کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ البتہ، جس دائرے میں شریعت خاموش ہے، اس میں وہ دین و مذہب، تہذیب وتمدن اور عرف ورواج کو

پیش نظر رکھتے ہوئے ہر طرح کی قانون سازی کر سکتے ہیں۔

اس باب میں جس طرز عمل کی اصلاح کی ضرورت ہے، وہ مخصوص علماے سابق کی تحقیقات یا اجتہادات پر عمل درآمد کے لیے اصرار ہے۔ اس طرح کی کوئی پابندی اسلام نے عائد نہیں کی۔ اس نے ہر زمانے کے ہر شخص کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ تحقیق واجتہاد کی صلاحیت بہم پہنچانے کے بعد دینی احکام کے حوالے سے اپنی آرا پیش کرے اور ان کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا، وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ، وَیَتَفَکَّرُوْنَ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، سُبْحٰنَکَ، فَقِنَا عَذَابَ

(یہ عقل[۲۶۴] کے اندھے ہیں، اِس لیے پیغمبر پر ایمان کے لیے نشانی مانگتے ہیں، ورنہ) حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کے بنانے میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو بصیرت والے ہیں۔ اُن کے لیے جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلووں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور زمین و آسمان کی خلقت میں غور کرتے رہتے ہیں۔[۲۶۵] (اُن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ) پروردگار، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو اِس سے پاک ہے کہ مقصد کے بغیر کوئی کام کرے۔ سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے

---

[۲۶۴] سورہ کی آخری فصل ختم ہوئی۔ یہاں سے اب خاتمۂ سورہ کی آیات شروع ہوتی ہیں۔

[۲۶۵] اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک اہل عقل اور ارباب بصیرت وہی ہیں جو اس کارخانۂ ہستی پر غور کر کے خدا اور آخرت کے ذکر و فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ کا ذکر ہر حال میں مطلوب ہے اور جس طرح یہ ذکر مطلوب ہے، اسی طرح فکر بھی مطلوب ہے، اس لیے کہ آخرت کا یقین اسی فکر سے

النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ، اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ، وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ، اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ، فَاٰمَنَّا

بچالے۔ پروردگار، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا، اُسے درحقیقت بڑی رسوائی میں ڈال دیا اور (وہ ایسی جگہ ہے کہ) ظالموں کا (وہاں) کوئی مددگار نہ ہوگا۔[۲۶۶] پروردگار، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا

حاصل ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض زبان کا ایک شغل بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

[۲۶۶] ان آیتوں میں قرآن نے کمال بلاغت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ جو سچے ارباب بصیرت خدا کو یاد رکھتے اور زمین و آسمان کی خلقت میں غور کرتے رہتے ہیں، ان کا یہ ذکر و فکر کس طرح انھیں صحیح نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ ذکر و فکر خود بخود ان کو اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا اور جب بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے، جتنا ظاہر ہو رہا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں گناہ گار اور نیکوکار، دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے، وہ ظاہر ہو۔

آسمان و زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں، ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگوں پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے۔ صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے، بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے۔ صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے، نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، بلکہ یہ ایک قدیر و حکیم، عزیز و غفور اور سمیع و علیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو اس کا کوئی خالق و مالک ہی نہیں ہے، یہ آپ سے آپ کہیں سے آدھمکی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی یا یہ کہ نعوذ باللہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرے مزاج کا ہے جو کسی کو گداگر، کسی کو تونگر، کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم بنا کر اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اس قدرت اور اس حکمت کے بالکل منافی ہیں جن کی شہادت اس

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رَبَّنَـا، فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا، وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا، وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا، وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ، وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴿۱۹۴﴾

تھا کہ لوگو، اپنے پروردگار کو مانو تو ہم نے مان لیا۔[۲۶۷] اب تو ہمارے گناہوں کو بخش دے، اے مالک۔ ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں (اپنے) وفادار بندوں کے ساتھ موت دے۔ پروردگار، اپنے رسولوں کی زبان سے جو وعدے تو نے کیے ہیں،[۲۶۸] وہ ہمارے لیے پورے کر دے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر۔ بے شک، تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔[۲۶۹] ۱۹۰-۱۹۴

کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے۔ ایسی علیم و حکیم ہستی کی شان علم و حکمت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے حکمت کام کرے۔

اس طرح اس کائنات کی قدرت و حکمت پر غور کرنے والا شخص نہ صرف خدا تک، بلکہ اقرار آخرت تک خود پہنچ جاتا ہے اور جس کا ذہن اس حقیقت تک پہنچ جائے گا، ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے تصور سے اس کا دل کانپ اٹھے گا اور اس کے اندر شدید داعیہ اس بات کے لیے پیدا ہوگا کہ وہ اس عذاب اور اس رسوائی سے پناہ مانگے جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اس دنیا کو بس ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھتے رہے اور اس طرح انھوں نے اپنی ساری زندگی بالکل بطالت میں گزار دی۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۲۷، ۲۲۸)

ان آیتوں کے آخری جملے پر غور کیجیے تو یہ بات بھی ان میں واضح کر دی گئی ہے کہ قیامت کے دن اس رسوائی سے زیادہ تر وہ لوگ دوچار ہوں گے جو جھوٹی شفاعتوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اس دن ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔

[۲۶۷] یعنی معجزات اور خوارق نہیں مانگے اور نہ کٹ حجتیاں کی ہیں، بلکہ پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ ہی ہمارے لیے معجزہ بن گیا۔ چنانچہ ہم نے جب یہ دیکھا کہ خدا اور آخرت پر ایمان کی یہ دعوت ہمارے دل کی آواز ہے، ہمارا باطن اس کی شہادت دیتا ہے اور علم و عقل بھی اسی کا تقاضا کرتے ہیں تو بغیر کسی تردد کے ہم نے اسے مان لیا ہے۔

[۲۶۸] اصل میں 'ما وعدتنا علی رسلك' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں ایک مضاف عربیت کے قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے، یعنی 'علی السنة رسلك'۔

[۲۶۹] اپنے ایمان پر اظہار فخر کے بجائے یہ ان ارباب بصیرت نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ جس طرح اس نے قبول حق کی توفیق عطا فرمائی ہے، اسی طرح وہ ان کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ، مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى، بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ، وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

سواُن کے پروردگار نے اُن کی یہ دعا (اِس طرح) قبول فرمائی کہ[270] مرد ہو یا عورت، میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا کوئی عمل ضائع نہ کروں گا۔[271] تم سب آپس میں ایک ہی ہو۔[272] لہٰذا جنھوں نے ہجرت کی ہے اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور میری راہ میں ستائے گئے اور (میرے لیے) لڑے اور مارے گئے ہیں، اُن کے گناہ میں اُن سے دور کر دوں گا اور ایسے باغوں میں اُن کو داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔[273] ۱۹۵

کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمائے اور اس راہ کی مشکلات اُن کے لیے آسان کر دے۔

[۲۷۰] یہ نہایت بلیغ اسلوب میں دعا کی قبولیت کا اظہار ہے۔ گویا ادھر یہ دعا زبان پر آئی اور ادھر جواب آ گیا کہ پروردگار نے اسے قبول کر لیا ہے۔

[۲۷۱] یہ ان تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت اور جہاد جیسے مراحل سے گزرے اور معاندین اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے رہے۔ مرد ہو یا عورت کے الفاظ اس جملے میں خاص طور پر اس لیے بڑھائے گئے ہیں کہ اس زمانے میں خواتین پر جو ستم توڑے جا رہے تھے، وہ ایسے سخت تھے کہ ان کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اس ٹکڑے نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا۔ اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دو لفظوں نے ان مظلوم خواتین کی کتنی ڈھارس بندھائی ہو گی جو محض اسلام کی خاطر طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۲۳۱)

[۲۷۲] یہ اس بات کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ مرد و عورت، دونوں کا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیوں ایک ہی حیثیت رکھتا ہے؟ اس سے اگر غور کیجیے تو قرآن نے ان تمام جاہلی نظریات کی تردید کر دی ہے جو عورت کو ایک فروتر مخلوق اور مرد کو اس کے مقابل میں برتر قرار دیتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ
جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾
وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ

اِس ملک کے شہروں میں منکروں کی یہ چلت پھرت[274] تجھے کسی مغالطے میں نہ ڈالے، (اے پیغمبر)۔ یہ تھوڑا سا لطف ہے،[275] پھر اِن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ اِس کے برخلاف جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے اُن کے لیے پہلی مہمانی ہے[276] اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، اُس کے وفادار بندوں کے لیے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۶-۱۹۸

اور (اِن وفادار بندوں سے اہل کتاب بھی خالی نہیں ہیں)۔ یہ حقیقت ہے کہ اِن اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں جو خدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں، اُس (کتاب) پر ایمان رکھتے ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے

---

[۲۷۳] اصل میں 'ثوابا من عند الله' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ثوابا' مصدر کے محل میں ہے اور اس کے معنی اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کے ردعمل میں اس عمل کے کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر کی بلاغت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح واضح فرمائی ہے:

> ''... بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا، ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ ورنہ ذرے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے۔ 'من عند الله، والله عنده حسن الثواب' کے الفاظ سے اسی بعد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہے تو تمھارے ہی عمل کا بدلہ، لیکن ہے اللہ کے پاس سے، جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں۔ وہ داتا جس کو جتنا چاہے دے دے۔ اس کے پاس کیا کمی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۳۱)

[۲۷۴] اصل میں لفظ 'تقلب' استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ آزادی و خود مختاری اور ایک نوعیت کا غلبہ اور زور ہے جو پیغمبر کے منکروں کو مسلمانوں کے مقابل میں اس وقت سرزمین عرب میں حاصل تھا۔

خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾

اور اُس پر بھی جو (اِس سے پہلے) اُن کی طرف نازل کی گئی تھی، اللہ سے ڈرتے ہوئے۔ وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ (وہ بہت جلد اُنھیں مل جائے گا)، اِس لیے کہ اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔ ۱۹۹

ایمان والو، (آخری فتح تمھاری ہوگی، لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ) صبر کرو، اپنے حریفوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، مقابلے کے لیے تیار رہو اور (تمام معاملات میں) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ کامیاب رہو۔ ۲۰۰

---

[۲۷۵] اصل میں 'متاع قلیل' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ خبر ہے جس کا مبتدا یہاں اس لیے حذف کر دیا گیا کہ ساری توجہ اسی خبر پر مرکوز رہے۔

[۲۷۶] اصل میں لفظ 'نزلا' آیا ہے۔ اس کا نصب حال کے لیے ہے اور یہ اس ضیافت کے لیے آتا ہے جو کسی مہمان کے آنے پر سب سے پہلے اسے پیش کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے پہلی پیش کش ہی جنت ہوگی۔ اس کے بعد انھیں مزید کیا ملنے والا ہے، اس کا اندازہ اس پیش کش سے کیا جا سکتا ہے۔

—— جاوید

اتوار، ۵ مارچ ۲۰۰۶ء

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

ایک شہید کے اجر سے متعلق روایت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

ابو داؤد، رقم ۲۴۸۸ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ

روی أنه جاءت امرأة إلی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یقال لها أم خلاد وهی منتقبة تسأل عن ابنها وهو مقتول فقال لها بعض أصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: جئت تسألین عن ابنك وأنت منتقبة؟ فقالت: إن أرزأ ابنی فلن أرزأ حیائی. فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ابنك له أجر شهیدین. قالت: ولم ذاك یا رسول اللّٰه؟ قال: لأنه قتله أهل الکتاب.

”روایت ہے کہ ایک مرتبہ ام خلاد نامی ایک خاتون نقاب اوڑھے اپنے اس بیٹے کی تلاش میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی جو شہید ہو چکا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی نے اس سے پوچھا: تم اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہی ہو، جبکہ تم نے نقاب اوڑھ رکھا ہے[1]؟ خاتون نے

[1] اس سوال کی وجہ شاید یہ ہو کہ نقاب کی موجودگی میں جب یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ خاتون کون ہے تو اس کے بیٹے کے بارے میں کیسے بتایا جا سکے گا۔

جواب دیا: اگر میں نے اپنا بیٹا کھو دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں نے اپنی حیا بھی کھو دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: تمھارے بیٹے کے لیے دو شہیدوں کا اجر ہے۔ اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، ایسا کیوں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: (ایسا اس لیے ہوگا) کیونکہ اسے اہل کتاب نے شہید کیا ہے۔"

یہ واقعہ بیہقی، رقم ۱۸۳۷۲ اور ابو یعلیٰ، رقم ۱۵۹۱ میں بھی روایت ہوا ہے۔

روایت پر تبصرہ

واقعہ کی تینوں روایات کی سند میں پہلے چار راوی مشترک ہیں۔ ان میں سے عبدالخبیر اور فرج بن فضالہ کے بارے میں سند کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔[۲]

نتیجۂ بحث

مذکورہ واقعہ کی کوئی بھی سند ایسی نہیں ہے جسے قابل اعتماد سمجھا جائے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کی نسبت کو درست نہ سمجھا جائے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

۲۔ عبدالخبیر کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے: الضعفاء الکبیر ۳/۱۱۵، الجرح والتعدیل ۶/۳۸، الکامل فی الضعفاء ۵/۳۴۷، المرجوحین ۲/۱۴۱، تہذیب الکمال ۱۶/۴۶۷، تہذیب التہذیب ۶/۱۱۳، ضعفاء البخاری ۱/۷۹، تقریب التہذیب ۱/۳۳۴، التاریخ الکبیر ۶/۱۳۷۔

فرج بن فضالہ کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے: الضعفاء الکبیر ۳/۴۶۲، الجرح والتعدیل ۷/۸۵، المرجوحین ۲/۲۰۶، تہذیب التہذیب ۸/۲۳۴، ضعفاء البخاری ۱/۹۵، تقریب التہذیب ۱/۴۴۴، التاریخ الکبیر ۷/۱۳۴، الکامل فی الضعفاء ۶/۲۸، الکاشف ۲/۱۲۰۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

ایمان کی شاخیں

(مسلم، رقم ۳۵)

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَان.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ اَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً. فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَان.

''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی ستر یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی چیز لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہے اور ان میں سے ایک چھوٹی سی چیز راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لغوی مباحث

شعبة: اصل معنی درخت کی شاخ کے ہیں۔ لیکن یہ اردو کے لفظ شاخ ہی کی طرح اجزاو فروع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بضع: 'بضع' ب کی فتح اور کسرہ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اس کے لغوی معنی ''کسی چیز کے حصے'' کے ہیں اور اس کا اطلاق تین سے دس اور ایک رائے کے مطابق تین سے نو کے عدد پر کیا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے سات مراد ہوتا ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ اس سے دو سے دس اور بارہ سے بیس کے درمیان کے عدد مراد ہوتے ہیں۔ 'بضع و سبعون' کا عدد محاورۃً استعمال ہوا ہے۔ اس سے کوئی خاص تعداد مراد نہیں ہے۔ یہ محض کثرت کے معنی ادا کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اعداد کا یہ استعمال ہماری زبان میں بھی ہے اور موقع ومحل کی مناسبت سے اس غرض کے لیے کوئی بھی عدد بولا جا سکتا ہے۔ عدد کے اس نوع کے استعمال کی مثال قرآن مجید میں بھی ہے۔ منافقین کے بارے میں دعا سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللّٰہ لھم' (تم ان کی مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ بھی مغفرت کی دعا کرو گے تو اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا)۔

افضلھا، ادناھا: 'افضل' کا لفظ یہاں اس کی دینی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ہے یعنی اس بات کو ماننے کا اجر اللہ کے ہاں سب سے زیادہ ہے۔ 'ادنیٰ' کے لغوی معنی ''سب سے کم'' کے ہیں۔ یعنی دینی اعمال میں اہمیت کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا عمل ہے۔

الحیاء: ایک نفسیاتی حالت، یعنی ان امور اور اشیا سے گریز، اعراض کی کیفیت اور احساس ندامت جن سے نسبت پر آدمی برا یا گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ جھجک بھی درحقیقت غلطی سے بچنے کے جذبے ہی کا بے محل اظہار ہے۔ اس لیے اس کے لیے بھی حیا کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

معنی

یہ روایت دین کی ایک اہم حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ روایت میں ایمان کے مظاہر کے لیے شاخ کے لفظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کو ایک پیڑ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایمان کے کشت دل میں جڑ پکڑتے ہی انسان کے افکار و اعمال میں جو عظیم الشان تغیر واقع ہوتا ہے اور انسان کے قول وفعل کی صورت میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، اسے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس پیڑ کی شاخیں قرار دیا گیا ہے۔قرآن مجید میں بھی کلمۂ طیبہ کو پیڑ ہی سے تشبیہ دی گئی ہے۔سورۂ ابراہیم میں ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (۱۴: ۲۴-۲۵)

''کیا تم نے غور نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے کس طرح کلمۂ طیبہ کی مثال بیان کی ہے۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کی مانند ہے، جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔''

اس آیت میں 'پھل' سے کردار کے وہی مظاہر مراد ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'شعبة' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن سراپا خیر ہو۔ اس کے عقائد صحیح خطوط پر استوار ہوں۔ اس کے اعمال اعمال صالحہ ہوں۔ اس کی خلقت میں ودیعت کردہ خیر یعنی عدل، حیا اور خیر خواہی وغیرہ پوری طرح فعال ہوں۔ اس کی فطرت کے صالح داعیات قوی ہوں اور وہ عوامل جو اسے برائی کی طرف دھکیلتے ہیں غیر موثر ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اس کے جذبات بھی ایمان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر صحیح محل اور مناسب صورت میں ظاہر ہونے لگیں۔

اس روایت میں یہ حقیقت نمایاں کی گئی ہے کہ ایمان محض کچھ حقائق کو تسلیم کر لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو جب دل میں اترتی ہے تو آدمی ایک نیا جنم لیتا ہے۔ اس کائنات کی اعلیٰ ترین سچائی کے اقرار سے وہ اس کائنات کے خالق و مالک سے جڑ جاتا ہے اور انسانوں سے اس کی خیر خواہی اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ وہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹائے بغیر آگے نہیں بڑھ پاتا۔ حیا کا جذبہ اپنی صحیح صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ کسی بھی برائی یا بری خصلت کو اپنے لیے باعث عار سمجھنے لگ جاتا ہے۔

بعض شارحین نے ایمان کے اجزا کو معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہاں عدد کسی معین تعداد کے بیان کرنے کے لیے نہیں ہے۔ دین کے تمام اجزا ایمانیات، عبادات اور معاملات ہر ہر چیز میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ایک عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ بنتے، یہی رویہ معین کرتے اور یہی اس کا ہدف طے کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متون

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی گفتگو سے ماخوذ یہ روایت متعدد محدثین نے نقل کی ہے۔ کسی نے صرف حیا والا جملہ ہی روایت کیا ہے۔ کسی نے ایمان کے شعبوں اور حیا والا جملہ روایت کیا ہے۔ اور اکثر نے اعلیٰ اور ادنیٰ والا جملہ بھی نقل کیا ہے۔ ایک آدھ روایت ایسی بھی ہے جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ والی بات تو نقل ہوئی ہے، لیکن حیا والا جملہ موجود نہیں ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے ان میں سے صرف دو متن منتخب کیے ہیں۔ اس روایت کے ان جملوں میں لفظی فرق بھی ہیں۔ کسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رسول اللہ کا لفظ آیا ہے اور کسی میں نبی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ ایمان کے مظاہر کے لیے کسی روایت میں شعبہ کا لفظ اور کسی میں باب کا لفظ آیا ہے۔ اکثر متون میں شعبہ کا لفظ مروی ہے۔ روایت کے معنی کے ساتھ اس کی مناسبت بھی زیادہ ہے۔ شعبوں کی تعداد کسی روایت میں ستر سے کچھ اوپر اور کسی روایت میں ساٹھ سے کچھ اوپر بتائی گئی ہے۔ بعض روایات میں راوی نے شک یعنی 'أو' کے ساتھ دونوں عدد دے دیے ہیں۔ ایک روایت میں 'اثنان و سبعون' یعنی بہتر (۷۲) کا لفظ بھی روایت ہوا ہے۔ بعض کے نزدیک ایمان کے مظاہر میں سے سب سے بڑی چیز توحید ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ارشادات میں توحید کے بیان کے لیے 'لا الٰه الا اللّٰه' کا کلمہ ہی اختیار کیا ہے۔ اس روایت میں بھی ایسا ہی ہے۔ البتہ کسی متن میں اس پر 'قول' اور کسی میں اس پر 'شهادة' کا لفظ مضاف کیا گیا ہے اور کسی روایت میں یہ ان کے بغیر نقل ہوا ہے۔ اسی طرح 'سب سے بڑی' کے لیے کسی روایت میں 'افضل'، کسی میں 'اعلٰی' اور کسی میں 'ارفع' کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ 'سب سے چھوٹی' کے لیے ان روایات میں 'ادنٰی' یا 'اوضع' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں 'ادنٰی' کا لفظ ہی درست ہے۔ اس جملے میں ایک دل چسپ اختلاف بھی منقول ہے۔ تقریباً تمام کتب روایت میں 'اماطة الأذی' ہی کا لفظ آیا ہے، لیکن ابوداؤد میں اس کے بجائے 'اماطة العظم' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'أذی' جیسے جامع لفظ کے مقابلے میں 'عظم' کا لفظ کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ کتب حدیث میں ایک روایت اور بھی ملتی ہے جس میں ایمان اور نفاق کے کچھ شعبے بیان ہوئے ہیں۔ یہ روایت واضح کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شعبے کے لفظ سے کس پہلو کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

عن أبی أمامة عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم قال: الحیاء و العی شعبتان من الایمان و البذاء و البیان شعبتان من	''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا اور کم گوئی ایمان کے دو شعبے ہیں اور فحش گوئی اور بسیار گوئی نفاق کے دو شعبے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

النفاق. (ترمذی، رقم ۲۰۲۷) ہیں۔''

کتابیات

بخاری، رقم ۹۔ مسلم، رقم ۳۵۔ ابوداؤد، رقم ۴۶۷۶۔ ترمذی، رقم ۲۶۱۴، ۲۰۲۷۔ نسائی، رقم ۵۰۰۴، ۵۰۰۵، ۵۰۰۶۔ ابن ماجہ، رقم ۵۷۔ احمد، رقم ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶۔ ابن حبان، رقم ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۸۱، ۱۹۰، ۱۹۱۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۷۳۵، ۱۱۷۳۶، ۱۱۷۳۷۔ الأدب المفرد، رقم ۵۹۸۔ ابن شیبہ، رقم ۲۵۳۳۹۔ معجم اوسط، رقم ۶۹۶۲، ۹۰۰۴۔

تصحیح

''اشراق'' مئی ۲۰۰۶ کے ''شذرات'' میں ''مصعب اسکول سسٹم'' کے زیر عنوان ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری صفحہ پر غلطی سے کیمبرج کی جگہ آکسفورڈ کا لفظ درج ہو گیا ہے۔ تصحیح کے بعد جملہ اس طرح پڑھا جائے گا: ''اس کے امتحانات کیمبرج یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوتے ہیں۔''

—— ادارہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شرح موطا

ساجد حمید

سمندر کا مردار حلال اور پانی پاک ہے

قال[1] ابو هريرة: جاء رجل الى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم، فقال: يـا رسول اللّٰه انا نركب البحر و نحمل معنا القليل من الماء فان توضانا به عطشنا افنتوضأ به؟

فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم: هو الطهور ماؤه، الحل ميتته.

''ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: اے رسول اللہ، ہم سمندر کے سفر کے لیے کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں، اس سفر پر ہم پانی کی بہت تھوڑی مقدار لے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اس پانی سے وضو کر لیں تو پھر پیاسے رہ جائیں گے، اس صورت میں کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟

آپ نے فرمایا: ہاں، اس کا پانی طاہر[1] اور اس کا مردار حلال ہے[2]۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ مراد یہ ہے کہ سمندر کا پانی عام پانی کی طرح ہے، اس لیے اس سے وضو کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ اس کا مردار حلال ہے۔ قرآن مجید میں مردار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مچھلی کے مردہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہونے کے باوجود حلال ہونے کے وجوہ یہ ہیں:

ایک تو اس کی وجہ یہ ہے کہ 'میتة' کا لفظ اپنے عرف میں مردہ مچھلی اور مردہ ٹڈی کے لیے نہیں بولا جاتا، اس لیے قرآن کی حرمتوں میں بیان شدہ 'میتة' (مردار) کی حرمت ان کو شامل نہیں ہو گی۔ استاد گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

''سمندر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ 'هو الطهور ماؤه الحل ميتته' بھی اسی تخصیص کے ساتھ ہے اور اس میں 'میتة' سے مراد مردہ مچھلی اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں ہی ہیں جن کے لیے لفظ 'میتة' باعتبار لغت تو بولا جا سکتا ہے، لیکن عرف و عادت کی رعایت سے انھیں 'میتة' نہیں کہہ سکتے''۔ (میزان ۳۱۳)

علامہ زمخشری اسی عرف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان القائل اذا قال: اكل فلان ميتة، لم يسبق الوهم الى السمك و الجراد. (الكشاف ۱/۲۱۵)

''جب کہنے والا یہ کہتا ہے کہ فلاں نے 'میتة' (مردار) کھایا تو کسی کا خیال مردہ مچھلی اور مردہ ٹڈی کی طرف نہیں جاتا۔''

دوسری وجہ یہ ہے کہ مچھلی اور ٹڈی، دونوں ایسے جانور ہیں، جن میں دم مسفوح نہیں ہوتا۔ اس لیے جب انھیں کاٹا جاتا ہے تو ان کا خون نہیں بہتا۔ چنانچہ خون والے جانوروں، مثلاً گائے بکری کے ذبح کرنے کی علت یعنی خون یہاں موجود نہیں ہے، اس لیے اس کے ذبح کا حکم موقوف ہو گا۔ چنانچہ انھیں خود پکڑ کر کاٹ لینا اور مردہ حالت میں پانا، دونوں یکساں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت ٹھیک انھی الفاظ کے ساتھ درج ذیل مقامات میں آئی ہے: موطا، رقم ۴۱، ابو داؤد، رقم ۸۳، صحیح ابن حبان، رقم ۱۲۴۳، مسند احمد، رقم ۸۷۲۰، السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم ۱۸۷۴۴، ابن ماجہ، رقم ۳۸۶، الدارمی، رقم ۷۲۹، ۲۰۱۱، صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۱۱، ۱۱۲، سنن الترمذی، رقم ۶۹، سنن النسائی (المجتبیٰ)، رقم ۵۹، ۳۳۲۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ روایت ان مقامات پر آئی ہے: صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۵۸، ۱۲۴۴، السنن الکبریٰ، رقم ۵۸، ۴۸۶۲، مسند احمد، رقم ۷۲۳۲، ۸۸۹۹، ۹۰۸۸، ۱۵۰۵۴، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۲، ۶، ۱۱۲۷، ۱۸۷۴۵، ۱۸۷۶۹، سنن ابن ماجہ، رقم ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۲۴۶، سنن النسائی، رقم ۴۳۵۰، مصنف عبدالرزاق، رقم ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱۔

یہ روایت مسند احمد، رقم ۸۸۹۹ میں ان الفاظ کے ساتھ بھی وارد ہوئی ہے:

عـن ابی هریرة ان ناسا اتوا النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فقالو: انا نبعد فی البحر ولا نحمل من الماء الا الاداوة والاداوتین لانا لا نجد الصید حتی نبعد أفنتوضا بماء البحر؟ قال نعم فانه الحل میتته الطهور ماؤه.

''ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے،اورآپ سے گزارش کی کہ ہم سمندر میں دور تک چلے جاتے ہیں، اور ہم بس دو ایک چھوٹے مشکیزے بھر کر پانی لے جاتے ہیں پھر جب ہم شکار نہیں پاتے تو ہمیں دور جانا پڑتا ہے، تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو وغیرہ کرلیا کریں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، کیونکہ اس کا مردار حلال اوراس کا پانی طاہر ہے۔''

بہت سی روایتوں میں سوال اورآنے والے کی نوعیت پر کوئی بات موجود نہیں ہے بس مختصر سے انداز میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ ُعـن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، فی ماء البحر هو الطهور ماؤه الحل میتته'' ''ابو ہریرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سمندر کے پانی کے بارے میں یہ بتایا، اس کا پانی پاک اوراس کا مردار حلال ہے۔''

اسی طرح یوں بھی روایت ہے:

عـن جابـر ان الـنبـی صـلـی اللّٰه علیه وسـلـم سـئـل عن ماء البحر فقال هو الطهور ماؤه الحل میتته.

''جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: یہ پاک ہے اوراس کا مردار حلال ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۵۸، مصنف عبدالرزاق، رقم ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۶۲، مسند احمد، رقم ۲۳۲ ۲۷، ۱۵۰۵۴، سنن البیہقی، رقم ۱۱۲۷، ۱۸۷۴۵، سنن ابن ماجہ، رقم ۳۸۸، ۳۲۴۶، صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۱۱۲ اورسنن النسائی، رقم ۴۳۵۰ میں آئی ہے۔

یہ روایت ان تفصیلات کے ساتھ بھی وارد ہوئی ہے:

عـن ابی هریرة یقول: کنا عند رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوما فجاءه صیاد . فـقـال: یـا رسـول الـلّٰه اخبرنا نـنطلق فی البحر نرید الصید، فیحمل

''ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مچھیرا آپ کے پاس آیا۔اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عرض کی: یا رسول اللہ ہمیں ایک بات بتائیے، ہم ماہی گیری کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معه احدنا الاداوة، وهو يرجو ان ياخذ الصيد قريبا، فربما وجده كذلك وربما لم يجد الصيد حتى يبلغ من البحر مكانا لم يظن ان يبلغه. فلعله يحتلم او يتوضا، فان اغتسل او توضا بهذا الماء فلعل احدنا يهلكه العطش. فهل ترى فى ماء البحر ان نغتسل به او نتوضا به اذا خفنا ذلك! فزعم ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: اغتسلوا منه وتوضاوا به فانه الطهور ماؤه، الحل ميتته.

(سنن البیہقی، رقم ۴۹۳)

غرض سے سمندر میں جاتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک اپنے ساتھ اس امید میں تھوڑا سا پانی لے لیتا ہے کہ شکار قریب ہی مل جائے گا، کبھی تو ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن کبھی ہمیں مچھلی نہیں ملتی ،اور ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہم سمندر میں ایسی جگہ جا پہنچتے ہیں کہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ وہاں آئے گا۔ اتنی دور نکل آنے کی بنا پر یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں نہانے یا وضو وغیرہ کی حاجت ہو جائے۔ اگر وہ پینے کے اس پانی سے نہا لے یا وضو کر لے تو (پانی ختم ہونے کی صورت میں) ہوسکتا کہ وہ پیاس سے مر جائے، بھلا آپ کی سمندر کے پانی کے بارے میں کیا رائے ہے، اگر ہمیں موت کا ڈر ہو تو کیا اس کے پانی سے وضو اور غسل کر سکتے ہیں؟ ابو ہریرہ کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا تھا: اس سے نہاؤ اور وضو بھی کرو، اس لیے کہ اس کا پانی طاہر اور اس کا مردار حلال ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ مسند احمد، رقم ۹۰۸۸، مصنف عبد الرزاق، رقم ۳۲۱، البیہقی، رقم ۲، ۶ میں آئی ہے۔ مسند احمد کی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

انه جاءه ناس صيادون فى البحر فقالوا يا رسول اللّٰه انا اهل ارماث وانا نتزود ماء يسيرا ان شربنا منه لم يكن فيه ما نتوضا به وان توضانا لم يكن فيه ما نشرب افنتوضا من ماء البحر فقال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم نعم فهو الطهور ماؤه الحل ميتته. (۹۰۸۸)

''آپ کے پاس کچھ لوگ آئے جو ماہی گیر تھے۔ انھوں نے آپ سے عرض کی: یارسول اللہ ہم چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے مالک ہیں، اس لیے تھوڑا سا پانی ہی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اگر ہم اس سے پی لیتے ہیں تو وضو کے لیے کچھ نہیں بچتا، اور وضو کریں تو پینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیا کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں، کیوں کہ اس کا

پانی طاہر اور اس کا مردار حلال ہے۔''

مصنف عبدالرزاق، رقم ۳۲۱ میں ان لوگوں کو بنی مدلج سے بتایا گیا ہے: 'ان ناسا من بنی مدلج سالوا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم انا نرکب ارماثا لنا'۔ ''بنو مدلج کے کچھ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم تختہ نما کشتیوں والے ہیں۔'' اسی روایت میں 'نتزود' کی جگہ پر یہ الفاظ آئے ہیں کہ: 'ویحمل احدنا مویها لشفته'۔ ''آدمی تھوڑا سا پانی ہونٹوں کی پیاس بجھانے کے لیے لے جاتا ہے۔''

مصنف عبدالرزاق کی مذکورہ بالا روایت میں سوال کے اندر یہ بات بھی بیان ہوئی ہے: 'فان توضانا بماء البحر وجدنا فی انفسنا وان توضانا منه عطشنا'۔ ''اگر ہم سمندر کے پانی سے وضو کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے دل میں کھٹکتی ہے، اور اگر صاف پانی سے نہائیں تو پیاس ستائے گی۔''

سنن البیہقی، رقم ٦ میں 'أتی نفر الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم'۔ ''ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا'' کے الفاظ آئے ہیں اور ان میں سوال اس انداز سے پوچھا گیا ہے: 'فقالوا أخبرنا نصید فی البحر ومعنا من الماء العذب فربما تخوفنا العطش فهل یصلح أن نتوضا من البحر الملح؟ فقال نعم توضؤوا منه'۔ ''انھوں نے کہا: ہمیں یہ بتائیے کہ ہم ماہی گیری کے لیے جاتے ہیں، اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے، جس وجہ سے پیاسے رہ جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے، تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیا کریں۔ آپ نے فرمایا: ہاں، اس سے وضو کر لیا کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ابن ماجہ، رقم ۳۸۷ میں یہی روایت یوں آئی ہے:

عن بن الفراسی قال: کنت اصید وکانت لی قربة اجعل فیها ماء وانی توضات بماء البحر فذکرت ذلك لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، فقال هو الطهور ماؤه، الحل میتته.

''ابن فراسی کی روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں ماہی گیری کرتا تھا، میری ایک چھوٹی سی مشک تھی، جس میں میں پانی لے جاتا تھا۔ میں سمندر کے پانی سے وضو کیا کرتا تھا، میں نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ نے فرمایا: سمندر کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے۔''

ان تمام مرویات کے خلاف جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک روایت سنن البیہقی، رقم ۱۸۷۶۹ یوں آئی ہے:

عن جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنه قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه

''جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز کو سمندر باہر نکال پھینکے،

وسلم: ما القى البحر او جزر عنه فكلوه وما مات فيه وطفا فلا تاكلوه عن جابر رضی اللّٰه عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال ما اصطدتموه وهو حی فکلوه وما وجدتم میتا طافیا فلا تاکلوه.

یا جس چیز کو چھوڑ کر سمندر پیچھے ہٹ جائے، وہ تو تم کھا لو، البتہ جو چیز اس کے اندر مر جائے اور اس کی سطح پر تیرنے لگے، تو اسے نہ کھاؤ، جابر ہی سے روایت ہے کہ جو تم شکار کرو اور وہ زندہ ہو تو وہ کھا لو، اور جو مردہ اور سطح سمندر پر تیرتی چیز پاؤ، تو اسے نہ کھاؤ۔‘‘

اگرچہ اس کی تاویل ممکن ہے، مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس روایت کو سنن البیہقی ہی میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللہ پر ایمان

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ، هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ، هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ، لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی، یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ. (الحشر ۵۹: ۲۲-۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، غائب و حاضر سے باخبر، وہ سراسر رحمت ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، بادشاہ، وہ منزہ ہستی، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بڑے زور والا، بڑائی کا مالک، پاک ہے اللہ اُن سے جو یہ شریک بتاتے ہیں۔ وہی اللہ ہے، نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت دینے والا، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔''

اللہ اس ہستی کا نام ہے جو زمین و آسمان اور تمام مخلوقات کی خالق ہے۔ اس میں الف لام تعریف کے لیے ہے اور یہ نام ابتدا ہی سے پروردگار عالم کے لیے خاص رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی یہ اسی

مفہوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دین ابراہیمی کے جو باقیات عربوں کو وراثت میں ملے تھے، یہ لفظ بھی انھی میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَلَئِنُ سَاَلُتَهُمُ مَّنُ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرُضَ، وَسَخَّرَ الشَّمُسَ وَالْقَمَرَ، لَيَقُوُلُنَّ اللّٰهُ، فَاَنّٰى يُؤُفَكُوُنَ؟ اَللّٰهُ يَبُسُطُ الرِّزُقَ لِمَنُ يَّشَآءُ مِنُ عِبَادِهٖ، وَيَقُدِرُ لَهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىُءٍ عَلِيُمٌ. وَلَئِنُ سَاَلُتَهُمُ مَّنُ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ، مَآءً فَاَحُيَا بِهِ الْاَرُضَ مِنُ بَعُدِ مَوُتِهَا، لَيَقُوُلُنَّ اللّٰهُ، قُلِ: الْحَمُدُ لِلّٰهِ، بَلُ اَكُثَرُهُمُ لَا يَعُقِلُوُنَ.

(العنکبوت ۲۹: ۶۱-۶۳)

”اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے تسخیر کر رکھا ہے، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کی روزی چاہتا ہے، کشادہ کرتا ہے اور جس کی چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی برسایا، پھر اِس کے ذریعے سے زمین کے مردہ ہو چکنے کے بعد اسے زندہ کر دیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ (اِن سے) کہو، شکر اللہ ہی کے لیے ہے، لیکن ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ ہستی کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ وہ سنن کیا ہیں جو اس نے اپنی ذات کے لیے مقرر کر رکھے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں یہی سوالات ہیں جو انسان کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایمان کے لیے یہ معرفت ضروری ہے۔ قرآن نے جب اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے تو ان سوالوں کا جواب بھی دیا ہے۔ یہ جواب کیا ہے؟ ہم یہاں اس کی وضاحت کریں گے۔

ذات

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتی۔ اس لیے کہ ادراک کے ذرائع جس ہستی نے پیدا کیے ہیں، وہ تو یقیناً انھیں پا سکتی اور ان کا احاطہ بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ ذرائع کسی طرح اس کا احاطہ نہیں کر سکتے جو خود ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہمارا ادراک محض انفعال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حواس انسان کو عطا فرمائے ہیں، ان میں سب سے اہم بصارت ہے۔ اس کے لیے اسے آنکھیں دی گئی ہیں، مگر ان کا حال بھی یہ ہے کہ کسی شے سے روشنی منعکس نہ

ہوتو وہ اسے دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ، وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ، وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ. (الانعام ۶:۱۰۳)

''اُسے نگاہیں نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین اور بڑا ہی باخبر ہے۔''

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یارائے نظر کی درخواست کا واقعہ قرآن نے اسی لیے سنایا ہے کہ انسان اپنے حدود سے واقف رہے اور ہمیشہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جس پیغمبر کو ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا، جب اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوا تو اوروں کی کیا حیثیت ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا، وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ، قَالَ: رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ، قَالَ: لَنْ تَرٰنِیْ، وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ، فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ، فَسَوْفَ تَرٰنِیْ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا، وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا، فَلَمَّآ اَفَاقَ، قَالَ: سُبْحٰنَکَ، تُبْتُ اِلَیْکَ، وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ. (الاعراف ۷:۱۴۳)

''اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوا اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو (اِس سے حوصلہ پا کر) اس نے عرض کی: پروردگار، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں، ذرا سامنے کے پہاڑ کو دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تم مجھے دیکھ سکو گے۔ چنانچہ جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو بولے: پاک ہے تیری ذات، میں تیری طرف لوٹتا ہوں اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

''...یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ وجبل بھی نہیں لاسکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لاسکو گے۔ انسان کی قوت برداشت محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں، لیکن یہ روشنی ایک حد خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں، لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے۔ بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے، جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آ کر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جان دار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں۔ تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگوں سے ماورا اور بالاتر ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۶۰)

اس میں شبہ نہیں کہ قیامت میں اہل ایمان اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ قرآن کی آیت 'كَلَّآ، اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ'[۳۵] سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دیکھنے کے مختلف درجات ہیں، لہٰذا یہ دیکھنا بھی نگاہوں کا خدا کو پا لینا نہیں ہے، اس کی نوعیت غالباً یہی ہوگی کہ حجابات اٹھا دیے جائیں اور لوگ اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھیں، جس طرح وہ سورج اور چاند اور نجوم و کواکب کو دیکھتے ہیں جس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ وہ ایک روشنی دیکھتے ہیں جو ان اجرام فلکی سے منعکس ہو کر ان تک پہنچتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے استفسار پر انھیں سمجھانے کے لیے یہی مثال دی[۳۶] اور فرمایا ہے کہ تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے کہ ایک ردائے کبریائی کے سوا کوئی چیز بھی درمیان میں حائل نہ رہے گی۔[۳۷]

اس کے بعد تشبیہ و تمثیل ہی کا طریقہ باقی رہ جاتا ہے۔ جنت اور دوزخ کے بیان میں قرآن نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ رویا میں اور عالم بیداری کے روحانی مشاہدات میں بھی نفس انسانی یہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس طریقے سے صرف انھی چیزوں کا کوئی تصور قائم کر سکتا ہے جن کے مماثل کوئی چیز کسی نہ کسی درجے میں اس کے اندر یا باہر موجود ہوتی ہے۔ ذات باری سے متعلق انسان کے پاس اس طرح کی کوئی چیز بھی نہیں ہے، لہٰذا اس کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰهِ الۡاَمۡثَالَ، اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. (النحل ۱۶: ۷۴)	''پس اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو، اس لیے کہ (اپنے آپ کو) اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔''

[باقی]

۳۵؎ المطففین ۸۳: ۱۵۔ ''ہرگز نہیں، اُس دن تو یقیناً یہ اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں گے۔'' قرآن نے یہ منکرین سے متعلق فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والے اس سے محروم نہ ہوں گے۔ ان کے لیے تمام پردے اور حجابات وہاں اٹھا دیے جائیں گے۔

۳۶؎ بخاری، رقم ۷۴۳۷۔ مسلم، رقم ۱۸۲۔

۳۷؎ بخاری، رقم ۴۸۷۸۔ مسلم، رقم ۱۸۰۔

پروفیسر خورشید عالم

چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن''

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

——— ۲ ———

مضمون کی دوسری قسط کو حافظ محمد زبیر سلفی صاحب نے دلیل ثانی کے طور پر حکمت قرآن کے جنوری ۲۰۰۶ کے شمارے میں پیش کیا ہے۔ اس میں مضمون نگار نے سورۂ نور کی آیت ۳۰ اور ۳۱ کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ان آیات مبارکہ کی تحقیق میں کوتاہی کی ہے۔ سورۂ احزاب کی آیات کے سلسلہ میں میں نے اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ کاش صاحب مضمون ان آیات کے بارے میں عربی مفسرین کا اسی طرح حوالہ دیتے جس طرح انھوں نے سورۂ احزاب کی آیات میں ان کے اقوال کو نقل کر کے قارئین کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا پردے کے اصل احکام یہی ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں پردے کے حدود بیان نہیں ہوئے، اس لیے اس سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ چہرے کا چھپانا واجب ہے یا نہیں؟ پردے کی حدود کو متعین کرنے والی سورۂ نور کی آیات ہیں جن کے بارے میں مضمون نگار نے مفسرین کے اقوال کو نقل کرنے میں دانستہ طور پر پہلو تہی کی ہے۔

سب سے پہلے فاضل مضمون نگار نے قرآن میں زینت کے مفہوم پر بحث کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ چونکہ قرآن میں زیادہ تر زینت کا لفظ کپڑوں یا بناؤ سنگار کی مادی چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے نہ کہ عورت کے اعضا کے لیے، اس لیے چہرہ زینت کے مفہوم میں داخل نہیں۔ قرآن حکیم کے کسی مفسر نے وہ نتیجہ نہیں نکالا جو صاحب مضمون

نے نکالا ہے۔ میں زینت کے بارے میں صاحب کشاف اور امام رازی کی فطری اور مصنوعی زینت کی بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے حافظ صاحب سے ایک سادہ سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر عورت نے بازوبند، گلوبند، کمربند، بالیاں اور پازیب نہ پہن رکھے ہوں تو ان زینتوں کو تمام مردوں کے لیے دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اللہ کے قول 'لا یبدین زینتھن الا لبعولتھن' (اور نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو، مگر اپنے شوہروں کے سامنے) میں بھی زینت سے مراد کپڑے اور بناؤ سنگار کی مادی چیزیں ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں زینت سے مراد مقامات زینت ہیں وگرنہ معاذ اللہ پوری آیت کا کوئی مفہوم نہ نکلے گا۔ اس بات کی طرف ابوبکر جصاص نے احکام القرآن (۳:۳۱۶) میں توجہ دلائی ہے۔ حافظ صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مذعومہ خیالات کی تائید کے لیے اتنی بڑی جسارت سے کام نہ لیں، جو تحریف کے زمرے میں ہو۔ لباس کو صرف اس وقت زینت کہا جا سکتا ہے جب بدن کا کوئی حصہ نمایاں ہو، لیکن اگر عورت نے پورا بدن جلباب سے ڈھانپ رکھا ہو تو ہم اس لباس کو زینت نہیں کہہ سکتے۔ معلوم ہوا کہ زینت سے مراد عضو زینت ہے، اسے کپڑوں سے تعبیر کرنا بے معنی ہے۔ کیونکہ بدن کے علاوہ کپڑوں کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ انھیں نہ پہننے کی صورت میں دیکھ رہے ہوں۔ جن زینتوں کا ظاہر کرنا جائز ہے، ان مقامات زینت کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے اور جن زینتوں کو چھپانا واجب ہے، ان مقامات کو چھپانا بھی واجب ہے۔ اس صورت میں اس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا کہ عورتیں اپنی زینتوں کو آشکارا نہ کریں، مگر وہ لباس جو اوپر پہنا جاتا ہے۔ اوپر پہنا جانے والا لباس قابل اخفا نہیں جس سے استثنا کیا جائے، لیکن اس کے برعکس ابن عباس، ابن عمر اور تابعین میں سے سعید بن جبیر، مجاہد، مسور بن مخرمہ، عبدالرحمان بن زید، عکرمہ، جابر بن زید، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک نے اس زینت سے مراد جس کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، چہرہ، ہتھیلی اور ان کی زینت یا صرف چہرہ اور ہتھیلی لیے ہیں۔ قدیم وجدید تمام مفسرین نے 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر ابن عباس یا ابن عمر کے قول کے مطابق کی ہے۔ جمہور علما کا یہی مسلک ہے جیسا کہ ابن رشد نے ''بدایۃ المجتہد'' (۱:۸۹) میں لکھا ہے۔ ان علما میں سے ائمۂ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کا یہی مسلک ہے اور امام احمد بن حنبل کا ایک قول بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ ابن ہبیرہ حنبلی نے اپنی کتاب ''الافصاح'' میں لکھا ہے کہ ائمۂ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے کہ چہرہ قابل پوشیدگی نہیں اور امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے۔ ابن قدامہ اور دیگر حنبلی فقہا نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ ابن مفلح حنبلی کا قول ہے کہ عورت پر واجب نہیں کہ وہ اپنا چہرہ چھپائے، بلکہ مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کرلے۔ ائمۂ اربعہ کے علاوہ امام اوزاعی، امام ابن حزم اور دور جدید میں یوسف القرضاوی اور شیخ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد غزالی جیسے فقہا کی بھی یہی رائے ہے۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے۔ اس کے ثبوت میں علم حدیث کے محقق علامہ البانی نے ''جلباب المراۃ المسلمہ'' کے صفحہ ۶۰ سے لے کر ۷۲ تک تیرہ مستند احادیث اور صفحہ ۹۶ سے لے کر صفحہ ۱۰۳ تک ۱۶ مستند آثار نقل کیے ہیں۔ مضمون نگار نے عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر کے اقوال پر تنقید کی ہے۔ مگر انھوں نے جن روایات پر تنقید کی ہے وہ تفسیر طبری میں ہیں۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۳: ۳۸۳) میں زیاد بن ربیع، صالح الدھان اور جابر بن زید کے حوالہ سے ابن عباس کا قول ہے جس میں راوی مسلم الملائی موجود ہی نہیں۔ دوسری روایت جو انھوں نے امام بیہقی سے نقل کی ہے وہی روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے اور اس میں احمد بن عبدالجبار موجود ہی نہیں جسے حافظ صاحب ضعیف ٹھہرا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی کتاب میں دو تین اور روایات ہیں جو ان اقوال کی تصدیق کرتی ہیں۔ علامہ البانی نے مصنف ابن ابی شیبہ میں عبداللہ بن عباس کے اقوال کو اپنی کتاب کے صفحہ ۵۹ پر صحیح قرار دیا ہے۔ یہ مضمون نگار کی صریح دیدہ دلیری ہے کہ وہ ان اقوال کو قرآن کے سیاق وسباق کے منافی قرار دے رہے ہیں گویا اکیسویں صدی میں جو بات حافظ محمد زبیر کو سمجھ آئی ہے اس کا ادراک کسی مفسر، کسی محدث اور کسی فقیہ کو نہیں ہوا۔

مضمون نگار حضرت عائشہ سے مروی ابوداؤد کی روایت کو گول کر گئے ہیں، جس کو کم وبیش سب مفسرین نے 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر کے سلسلہ میں پیش کیا ہے جو اگرچہ مرسل ہے، مگر اس کی تقویت امام بیہقی، امام ذہبی، امام منذری، امام شوکانی، زیلعی اور ابن حجر عسقلانی کے پایے کے محدثین نے کی ہے۔ امام بیہقی ابن عباس کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ دیگر صحابہ نے زینت ظاہرہ کی جو تعریف کی ہے اس سے اس قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

رہا عبداللہ بن مسعود کا قول تو اس کی طرف کسی صاحب علم نے توجہ نہیں دی۔ علامہ البانی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۵۳ پر اس کے دو سبب بیان کیے ہیں:

ایک یہ کہ ابن مسعود نے زینت ظاہرہ سے مراد مطلقاً کپڑے تو لیے ہیں، مگر اس اطلاق کا اقرار بھی نہیں کرتے۔ کپڑوں میں تو داخلی کپڑے بھی شامل ہیں، مگر وہ اس سے مراد صرف اوپر والے کپڑے یعنی جلباب لیتے ہیں۔ زینت کا اطلاق تو داخلی کپڑوں پر ہوتا ہے نہ کہ ظاہری کپڑوں پر۔

دوسرے یہ کہ یہ تفسیر آیت کے بقیہ حصے یعنی 'لا یبدین زینتھن الا لبعولتھن' سے لگا نہیں کھاتی، کیونکہ یہ زینت بعینہٖ وہی ہے جو پہلی زینت ہے۔ عربی زبان کا اسلوب ہے کہ جب اسم معرفہ کو دہرایا جاتا ہے تو وہ بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو پہلے مذکور ہو۔

مضمون نگار نے اپنے موقف کی تائید میں ابن عطیہ کے قول کا حوالہ دیا ہے، جنھوں نے استثنا سے مراد وہ چیز لی ہے جو اس پر غالب آ جائے۔ امام قرطبی نے ابن عطیہ کے قول پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''میں کہتا ہوں کہ یہ قول خوب ہے، مگر چونکہ چہرے اور ہاتھ میں غالب آنے والی چیز عادتاً اور عبادتاً ان کا ظہور ہے جیسا کہ حج اور نماز میں ہوتا ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ استثنا ان دونوں کے بارے میں ہو۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔''

عادتاً اور عبادتاً چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے اور انھیں چھپانے کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علامہ البانی نے حافظ ابن قطان فاسی کے حوالے سے کھل کر بات کی ہے۔ اسے ''جلباب المراۃ المسلمہ'' کے صفحہ ۵۱ سے صفحہ ۵۳ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ بڑی ہی بصیرت افروز بحث ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

سورۂ نور کی آیات

صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ ''سورۂ نور کے پردے کی آیات گھر کے اندر پردے کے متعلق ہیں نہ کہ گھر کے باہر کے پردے کے، جبکہ گھر سے باہر کے پردے کا ذکر سورۂ احزاب کی آیات میں ہے۔'' سچی بات یہ ہے کہ گھر کے اندر پردے کا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ گھر تو بذات خود پردہ ہوتا ہے، پردے کے اندر پردہ کیا معنی؟ اس بات کا ذکر کسی قدیم و جدید عربی مفسر نے نہیں کیا۔ اس بات کو تو صاحب مضمون نے بھی تسلیم کیا ہے جبھی وہ خود فرماتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ کر مدت سے علما نے ٹھوکر کھائی ہے۔ ان میں ان کے نزدیک سیدہ عائشہ، ابن عباس، ابن عمر، کبار تابعین ہیں اور انھی میں طبری، زمخشری، رازی، ابن حبان اندلسی، محمود آلوسی، قرطبی، نسفی، طنطاوی جوہری، سید قطب شہید، عبدالحمید کشک اور شیخ طاہر بن عاشور کے مرتبہ کے مفسر ہیں۔ اس سے اگر بچے ہیں تو مولانا حافظ محمد زبیر صاحب سلفی۔

عورت نے تو اجنبی مرد سے پردہ کرنا ہے خواہ وہ گھر کے اندر ہو یا باہر۔ کیا مضمون نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت اگر گھر کے اندر ہو تو وہ چہرہ کھلا رکھے گی اور صرف گھر کے باہر چہرہ چھپائے گی؟ اگر یہ بات ہے تو ہمارا یہ موقف ثابت ہو گیا کہ عورت پر اجنبی کے سامنے چہرہ چھپانا واجب نہیں۔ یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنوں کے سامنے بھی نگاہیں نیچی کر کے گھومے پھرے گی اور گھر کے مرد بھی ایسا کریں گے اور وہ محرم مردوں کے سامنے زمین پر پاؤں نہیں مارے گی، اس خوف سے کہ اس کی مخفی زینت ظاہر نہ ہو جائے۔ اگر یہ بات ہے تو حافظ صاحب مجھے کوئی ایسا گھر دکھا دیں، جہاں محرم عورت اور مرد نگاہیں نیچی کر کے رہتے ہوں اور جہاں عورت اس ڈر سے پاؤں زمین پر نہ مارتی ہو کہ کہیں

اس کا گھر والا پائل کی جھنکار نہ سن لے۔ سورۂ نور کی آیات ۳۰ اور ۳۱ اپنے مضمون کے لحاظ سے اس رائے کو باطل قرار دیتی ہیں۔ آیت ۳۰ اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ عورت کے جسم میں کوئی ایسی ننگی چیز ضرور ہے جس کی طرف نگاہ اٹھنے کا امکان ہے اور یہ چیز چہرے اور ہاتھوں کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور یہ آیت یہ بھی بتلاتی ہے کہ اس کا تعلق ایسے مقام سے ہے، جہاں اجنبی مرد اور اجنبی عورتیں گھوم پھر رہی ہوں جبھی تو اللہ نے عورت اور مرد کو نگاہیں نیچی رکھنے کا برابر کا حکم دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق، جیسا کہ مضمون نگار کہتے ہیں، گھر کے اندر سے ہے یا گھر کے باہر سے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ اس کا تعلق گھر سے باہر کے پردہ سے ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، بیہقی اور احمد نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایاکم والجلوس با لطرقات فاذا ابیتم الا المجالس فاعطوا الطریق حقه قالوا ما حق الطریق یا رسول اللّٰه؟ قال غض البصر.	''تم لوگ سرراہ بیٹھنے سے بچو اور اگر تمھیں بیٹھنا ہی پڑ جائے تو راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول، راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا: نگاہیں نیچی کرنا۔''

راستے گھر کے اندر نہیں ہوا کرتے۔ اس نص قطعی کی مخالفت میں یہ جملہ تراشنا کہ اس کا تعلق گھر کے اندر سے ہے، کہاں کا انصاف ہے؟

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'یا علی لا تتبع النظرة النظرة فان لك الاولی ولیست لك الآخرة' (اے علی، ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو کیونکہ پہلی نظر تو تمھاری ہے دوسری تمھاری نہیں۔) یعنی پہلی نظر جائز ہے۔ اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی اور طحاوی نے بیان کیا ہے۔ حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح تسلیم کیا ہے۔ امام ذہبی بھی ان سے متفق ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پہلی نظر جو جائز ہے، کہاں پر پڑتی ہے؟ ظاہر ہے کہ چہرے پر۔ گھر کے اندر پڑتی ہے یا باہر، ظاہر ہے کہ گھر کے باہر۔

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، دارمی، طحاوی، بیہقی، حاکم اور امام احمد نے جریر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ 'سالت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن نظر الفجاة فامرنی ان اصرف نظری' (میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نظر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ اپنی نظر پھیر لو۔) علامہ ابن مفلح حنبلی نے اپنی کتاب ''الآداب الشرعیہ'' میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا عورت پر اپنا چہرہ چھپانا واجب ہے یا چہرے کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کرنا واجب ہے؟ جریر بن عبداللہ سے مروی حدیث بیان کر کے وہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دلیل ہے کہ عورت پر راہ چلتے اپنا چہرہ چھپانا واجب نہیں۔ اسے (زیادہ سے زیادہ) مستحب کہا جا سکتا ہے۔ ہاں، مرد پر ہر حالت میں واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں بچائے، وہ صرف شرعی غرض کے لیے دیکھ سکتا ہے۔ شیخ محی الدین نووی نے بھی اسی بات کا ذکر کیا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ہمارے اور شافعیوں کے نزدیک اجنبی عورت کی طرف بغیر شہوت اور خلوت کے دیکھنا جائز ہے۔''

'غض البصر' کا حکم اس بات کے لیے نص قطعی ہے کہ چہرہ چھپانا واجب نہیں۔ سورۂ نور کی آیت ۳۱ کا یہ ٹکڑا 'ولا یضربن بارجلهن لیعلم ما یخفین من زینتهن'' ''اور اپنے پاؤں کو زمین پر نہ ماریں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت کی چیزیں معلوم ہو جائیں (یعنی پازیب کی جھنکار نہ اٹھے)'' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس حکم کا تعلق بھی 'ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن' کی طرح گھر کے باہر سے ہے نہ کہ گھر کے اندر سے۔ ثابت یہ ہوا کہ سورۂ نور کی آیت ۳۰ اور ۳۱ گھر سے باہر پردے کے بارے میں ہے، اسے گھر کے اندر پردے سے مخصوص کرنا کتاب و سنت کی واضح خلاف ورزی ہے۔

علامہ ناصر الدین ''جلباب المراۃ المسلمہ'' کے صفحہ ۸۶ پر رقم طراز ہیں کہ ''یہ سمجھنا کہ جلباب اوڑھنا صرف گھر سے باہر ضروری ہے، درست نہیں، عورت گھر سے باہر ہو یا گھر کے اندر اسے جلباب پہننا چاہیے۔'' اپنے قول کی تائید میں انھوں نے قیس بن زید کی روایت پیش کی ہے اور صفحہ ۸۷ کے حاشیہ میں تفصیل کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے اور بتایا ہے کہ روایت صحیح ہے۔ روایت یوں ہے:

''بے شک، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ بنت عمر کو طلاق دی... پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں آئے تو انھوں نے جلباب اوڑھ لیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جبریل آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ حفصہ سے رجوع کر لو وہ تو روزہ دار اور شب بیدار ہیں۔ وہ جنت میں آپ کی بیوی ہوں گی۔''

اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۵ پر حضرت عائشہ سے مروی ایک حدیث ابن سعد کے حوالہ سے پیش کی ہے کہ 'لا بد للمراۃ من ثلاثة اثواب تصلی فیهن. درع و جلباب و خمار'، ''عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تین کپڑوں میں نماز پڑھے۔ قمیص، جلباب (چادر یا گاؤن) اور اوڑھنی۔'' نماز تو عورت گھر کے اندر بھی پڑھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جلباب گھر سے باہر ہی پہنا جائے۔

فاضل مضمون نگار نے آیت کے ایک ایسے ٹکڑے سے جو چہرہ کھلا رکھنے کے بارے میں نص قطعی ہے، بالکل غلط استدلال کیا ہے۔ وہ ٹکڑا ہے: 'ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن'، ''چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں

پر اچھی طرح ڈال لیں۔'' مفسرین نے اس ٹکڑے کا شان نزول یہ لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں اپنا دوپٹا سر پر اوڑھ کر اس کے کناروں کو نبطیوں کی مانند پیٹھ پر لٹکا لیتی تھیں، جس سے ان کا گریبان اور سینہ کھلا رہتا تھا۔ یہ حکم اسی بارے میں نازل ہوا ہے۔ امام ابن حزم اندلسی المحلیٰ میں فرماتے ہیں:

فامرھن اللّٰہ تعالیٰ بالضرب بالخمار علی الجیوب . وھذا نص علی ستر العورۃ والعنق والصدر وفیہ نص علی اباحۃ کشف الوجہ، لا یمکن غیر ذلك. (۳:۲۱۶، ۲۱۷)

''پس اللہ نے عورتوں کو اوڑھنیاں سینوں پر اچھی طرح لپیٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ آیت ستر گردن اور سینے کو چھپانے کے بارے میں نص کا درجہ رکھتی ہے اور یہ اس بات پر منصوص ہے کہ چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔''

آپ نے اندازہ کیا کہ امام موصوف کس پرزور انداز میں کہہ رہے ہیں کہ یہ چہرہ کھلا رکھنے کے بارے میں نص قطعی ہے، اسی لیے اللہ نے اوڑھنیوں کو چہرے پر ڈالنے کا حکم نہیں دیا۔ اور ایک ہمارے حافظ صاحب ہیں جو میبذی اور ایساغوجی کی فرسودہ منطق کی سان پر کلام الٰہی کو چڑھا کر اپنے مزعومہ خیالات کی تائید فرما رہے ہیں۔ پتا نہیں یہ دلالت اولیٰ کس بلا کا نام ہے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علامہ البانی نے ''جلباب المراۃ المسلمہ'' صفحہ ۵۷ میں حافظ ابن القطان کے حوالہ سے بتایا ہے کہ سورۂ نور کی آیت کا یہ ٹکڑا 'یدنین علیھن من جلابیبھن' کی تفسیر ہے۔ یعنی اس میں 'ادناء' کی حد کا تعین کیا گیا ہے کہ وہ اتنا نیچے کیا جائے گا جس سے کانوں کی بالیاں اور گلے کا ہار چھپا رہے گا۔ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ سورۂ نور کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہو گیا کہ چہرہ چھپانا واجب نہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ چہرہ 'ادنـاء' کی قید سے آزاد ہے، وگرنہ دونوں آیات میں تعارض رہے گا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت میں لفظ 'ادناء' کے کنایہ سے چہرہ مراد لیا گیا اور سورۂ نور کی آیت میں طریق اولیٰ کی دلالت سے چہرہ مراد لیا گیا۔ ایسا حکم جو واجب کا درجہ رکھتا ہو، اس کو صراحت سے بیان کرنے کی بجائے کنایہ اور دلالت اولیٰ سے کام لیا گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کو ایک واجب حکم صادر کرنے کے لیے (معاذ اللہ) نہ چہرے کی عربی آتی تھی اور نہ چھپانے کی؟ کچھ تو خدا سے ڈرنا چاہیے۔

حافظ صاحب نے حافظ ابن حجر کا قول نقل کیا ہے کہ 'اختمرن' سے مراد ہے کہ انھوں نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے۔ اسی حوالہ یعنی الفتح (۸:۴۹۰) پر حافظ ابن حجر کا یہ قول ہے کہ 'و الخمار للمراۃ کالعمامۃ للرجل'، ''عورت کے لیے اوڑھنی ایسے ہے جیسے مرد کے لیے پگڑی۔'' قدیم وجدید سب علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خمار سے مراد

اوڑھنی ہے۔اوراس بارے میں حدیث ہے کہ 'لا یقبل اللّٰہ صلاۃ حائض الا خمار'، ''اللہ سن بلوغ تک پہنچنے والی عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔'' النہایہ ابن اثیر، تفسیر حافظ ابن کثیر اور شوکانی کی فتح القدیر میں کہا گیا ہے کہ 'خمر' جمع ہے 'خمار' کی جس سے سر ڈھانپا جاتا ہے۔ لغت کی کتابوں میں 'خَمَر' اور 'خمّر' کے معنی ڈھانپنے کے آتے ہیں، مگر 'اختمر' اور 'تخمّر' (باب افتعال اور تفعل) کے معنی صرف اور صرف اوڑھنی لینے کے ہیں۔

مضمون کی تیسری قسط میں فرماتے ہیں کہ حجاب کے جو معنی پروفیسر صاحب مراد لیتے ہیں یعنی آڑ اور اوٹ، وہ اس کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کے منافی ہیں۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں لغت کا ایک ہی حوالہ دیا ہے جو لفظ حجاب کے بارے میں لسان العرب کے الفاظ ہیں: 'کل ما حال بین شیئین حجاب'، ''یعنی دو چیزوں کے درمیان حائل ہونے والی ہر چیز کو حجاب کہا جاتا ہے۔'' میں نے بھی تو یہی کہا ہے کہ اس سے مراد آڑ اور اوٹ ہے نہ کہ پہناوا۔ یہ تو میرے ہی موقف کی تائید ہے۔ میرا مضمون نویس سے مشورہ ہے کہ لغت دیکھنے کی عادت ڈالیں، تحقیق کا پہلا قدم یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس قسط میں حافظ صاحب نے حجاب کے بارے میں جو بحث کی ہے، اس کا مکمل جواب میرے مضمون میں موجود ہے۔ حافظ صاحب از راہ عنایت اس مضمون کا بغور مطالعہ کریں۔ ہاں دلیل رابع میں حافظ صاحب نے حسب عادت قرآن حکیم کی آیت کو اپنے مزعومہ خیالات پر چسپاں کرنے کی غلطی کی ہے، اس کی نشان دہی ضرور کروں گا۔

سورۂ نور میں ارشاد ربانی ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیۡ لَا یَرۡجُوۡنَ نِکَاحاً فَلَیۡسَ عَلَیۡهِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ یَّضَعۡنَ ثِیَابَهُنَّ غَیۡرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیۡنَةٍ (۲۴:۶۰)

''اور بڑی عمر کی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (اوپر کے) کپڑے اتار رکھیں بغیر اس کے کہ سنگار دکھاتی پھریں۔''

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ 'ثیاب' سے مراد اضافی کپڑے ہیں، مثلاً جلباب یا نقاب، نہ کہ دوپٹا یا سینے کو ڈھانپنے والی چادر۔

'ثیاب' سے مراد اوپر والا لباس ہے۔ اس کی تفسیر روح المعانی میں یوں کی گئی ہے:

ای الثیاب الظاهرة لا یفضی وضعها لکشف العورة کالجلباب والرداء والقناع الذی فوق الخمار. (۱:۲۱۶)

''اس سے مراد اوپر والا لباس ہے جس کے اتارنے سے ستر ننگا نہیں ہوتا، مثلاً جلباب، چادر اور سر پوش جو اوڑھنی کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔''

ابن جریر طبری جن کا حافظ صاحب نے حوالہ دیا ہے، نے بھی یہی تعبیر کی ہے 'ثیاب' یعنی جلباب اور جلباب سے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مراد وہ چادر یا سرپوش ہے جو اوڑھنی کے اوپر لیا جاتا ہے۔ حافظ صاحب نے عربی لغت سے بے خبری کی وجہ سے 'قناع' کا ترجمہ نقاب کیا ہے جو قطعی غلط ہے۔ 'قناع'، 'مقنع' اور 'مقنعة' سے مراد سرپوش ہے نہ کہ نقاب۔ المعجم الوسیط میں ہے 'القناع ما تغطی به المراة راسها' ''قناع اسے کہا جاتا ہے جس سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے۔'' صحاح اور القاموس المحیط میں 'المقنع و المقنعة' کے یہی معنی لکھے ہیں کہ اس سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے۔ یہ غلطی حافظ صاحب سے اس لیے سرزد ہوئی ہے کہ ان کے سر میں یہ سودا سمایا ہوا ہے کہ جلباب سے چہرہ ڈھانپا جاتا ہے جو بات صریحاً لغت اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔

البحر المحیط میں 'ثیاب' کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''جلباب، چادر، وہ چادر جو اوڑھنی سے اوپر لی جاتی ہے۔ چادر جو کپڑوں کے اوپر اوڑھی جاتی ہے یا اوڑھنیاں یا چادر اور اوڑھنی، بہت سے اقوال ہیں۔'' وہ عورت جو سن رسیدہ ہو جاتی ہے اسے 'امراۃ واضع' یعنی ایسی عورت جو اپنی اوڑھنی اتار دیتی ہے، کہا جاتا ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نہ دوپٹا ہے نہ چادر، اب حافظ صاحب کی بات مانی جائے یا ابوحیان اندلسی کی جو لغت کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ایک قرأت کا ذکر کیا ہے جو سدی نے اپنے شیوخ سے روایت کی ہے، وہ یوں ہے:

ان یضعن خمرھن رؤسھن. (۲۳:۳۴) ''یعنی اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سروں سے اتار دیں۔''

اکثر مفسرین نے 'ثیاب' سے مراد جلباب لیا ہے یعنی بڑی عمر کی عورتوں کو یہ چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ جلباب یعنی چادر اپنے سر سے اتار دیں۔ فقہ جعفری میں عبداللہ حلبی نے ابوعبداللہ امام جعفر سے روایت کی ہے کہ انھوں نے 'ثیاب' سے مراد خمار اور جلباب، دونوں لیے ہیں۔ یعنی بوڑھی عورتیں اوڑھنی اور جلباب، دونوں اتار سکتی ہیں بشرطیکہ خودنمائی اور خودآرائی نہ کرنا چاہیں۔

علامہ ناصر الدین البانی نے ''جلباب المراۃ المسلمہ'' کے صفحہ ۱۸۵ پر آیت زیر بحث سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ یہ آیت اس بات پر منصوص ہے کہ عورت کے لیے واجب ہے کہ وہ اوڑھنی پر جلباب (بڑی چادر) اوڑھے۔ وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ چہرہ کو ستر سمجھنے والے ایک ایسی بات پر، جو واجب نہیں زور دیتے ہیں، مگر اس بات پر زور نہیں دیتے جو واجب ہے یعنی اوڑھنی کے اوپر چادر لینا۔

اس تحقیق کی روشنی میں حافظ زبیر صاحب کا 'فلیس علیھن جناح' سے استدلال بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں مضمون نگار سے بار دگر گزارش کرتا ہوں کہ وہ آیات قرآنی کو اپنے روایتی خیالات پر چسپاں کرنے سے گریز کریں۔

www.javedahmadghamidi.com

خلاصۂ بحث

ا۔ اگر دلوں میں تقویٰ نہ ہو تو چہرے پر گز بھر کپڑا ڈال کر مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی ذہنی خباثت سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت کرنے کا یہ فطری ملکہ بچپن میں حسن تربیت اور بڑے ہو کر صحیح مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآنی تعبیر لباس التقویٰ کے یہی معنی ہیں۔

۲۔ چہرے کا پردہ واجب نہیں جس چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے جائز قرار دیا ہے، اسے حرام قرار دینا گناہ ہے۔

۳۔ سورۂ احزاب کا نزول سورۂ نور سے پہلے ہوا۔ آیت ۵۹ ان عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کو اوباشوں کی ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں پردے کے حدود کا تعین نہیں۔ یہ آیت آمد و رفت میں وقار کے دستور کے بارے میں ہے۔

۴۔ جلباب کا مقصد چہرہ چھپانا نہیں۔ قرآن کی آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے، وگرنہ اس سے پہلے 'یدنین علیھن' کا اضافہ نہ کیا جاتا۔

۵۔ 'ادناء' کے بنیادی معنی جیسا کہ احمد بن فارس نے ''مقاییس اللغۃ'' میں، ابن قتیبہ دینوری نے ''مشکل القرآن'' میں اور امام راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں لکھا ہے: ''قریب کرنے کے ہیں یعنی پہننے کے لیے قریب کر لیں۔'' اگر 'ادناء' کو آیت زیر بحث میں اپنے اصل معنوں میں لیا جائے تو چہرے کو چھپانے اور نہ چھپانے کی بحث سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔

۶۔ 'ادناء' کے مجازی معنی نیچا کرنے یا لٹکانے کے بھی لیے گئے ہیں۔ مفسرین نے 'ادناء' کے کنایہ سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ جلباب کا کچھ حصہ چہروں پر بھی ڈال لیا جائے تا کہ عورت بدفطرت لوگوں کی دست درازی سے کلیتہً محفوظ ہو جائے۔ اس بات کی طرف ان کی توجہ ان ضعیف روایتوں نے دلائی ہے کہ یہ حکم لونڈیوں کے مقابل آزاد عورتوں کے لیے ہے، یہ تمام مفسرین اس حکم کو دائمی اور کلی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے انھوں نے سورۂ نور کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا واجب نہیں۔

۷۔ (ا) مضمون نگار نے سورۂ احزاب میں مفسرین کے اقوال کو تفصیل سے ذکر کر کے اور سورۂ نور میں ان کے اقوال کو نظر انداز کر کے علمی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔

(ب) آیت حجاب میں لفظ حجاب کے معنی اوٹ اور آڑ ہیں نہ کہ پہناوا۔ اس آیۂ کریمہ کا شان نزول، انداز تخاطب اور خاتمہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ آیت امہات المومنین کے ساتھ خاص ہے۔ منافقوں کی سازشوں کے پیش نظر امہات المومنین کو خاص خاص باتوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۸۔سورۂ نور سورۂ احزاب کے بعد نازل ہوئی۔ بدن کے کن اعضا کو ظاہر کرنا ہے اور کن کو چھپانا واجب ہے، اس کا تعین اسی سورۂ مبارکہ میں کیا گیا ہے اور اس بارے میں یہ قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

۹۔'الا ما ظھر منھا' (سوائے اس کے جو ظاہر ہو جائے) کی تفسیر کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک قول عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر کا ہے جس کی تائید ابوداؤد میں حضرت عائشہ سے مروی حدیث بھی کرتی ہے۔ اس قول کے مطابق چہرہ اور ہاتھ ظاہری زینت میں شامل ہیں، ان کا چھپانا واجب نہیں۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں اسی قول پر عمل ہوتا رہا ہے۔ جمہور صحابہ، تابعین، مفسرین، محدثین، اور ائمۂ اربعہ نے اسی قول کی تائید کی ہے۔ دوسرا قول عبداللہ بن مسعود کا ہے کہ زینت ظاہرہ سے مراد اوپر والے کپڑے یعنی جلباب ہے۔ کسی صاحب علم نے اس قول کی طرف توجہ نہیں دی، کیونکہ وہ بقول امام ابوبکر الجصاص، بے معنی ہے۔

۱۰۔غض بصر کا حکم اور دوپٹوں کو سینے کے گرد لپیٹنے کا حکم اس بارے میں نص قطعی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ چھپانا واجب نہیں۔

۱۱۔سورۂ نور کی آیات کا تعلق گھر سے باہر ماحول سے ہے، جیسا کہ آیت ۳۰ اور ۳۱ کے نفس مضمون اور احادیث نبوی سے ثابت ہوتا ہے۔

۱۲۔مضمون نویس نے قرآنی آیات 'یحفظن فروجھن، ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن، لا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن او لیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن' کو وہ معنی پہنانے کی جسارت کی ہے جو ان کے مزعومہ تصورات کے مطابق ہیں۔ ان کی یہ جسارت آیات قرآنی کی تحریف کے مترادف ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ انھوں نے ان آیات کی تفسیر بغیر کسی سند اور حوالے کے کی ہے۔

۱۳۔مضمون نویس نے عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر کے اقوال کی تکذیب کر کے انھیں قرآن کے سیاق و سباق کے منافی قرار دیا ہے۔ میں نے ان کے اس زعم باطل کی تردید ''جواب آں غزل'' میں کر دی ہے۔

میری مولانا حافظ محمد زبیر سلفی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ بدن کے ان اعضا کو چھپانے پر زور دیں جن کا چھپانا کتاب و سنت کی رو سے واجب ہے، عصر حاضر میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہے اور ان چیزوں کو چھپانے کے لیے اپنا وقت اور طاقت ضائع نہ کریں جن کو کتاب و سنت کی رو سے ظاہر کرنا جائز ہے۔ اللہ کی جائز قرار دی ہوئی چیز کو حرام قرار دینا بہت بڑا جرم ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الطاف احمد اعظمی

سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی ناکامی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اٹھارہویں صدی ہندی مسلمانوں کے سیاسی زوال کے آغاز کی صدی ہے۔ اس دور زوال میں شاہ ولی اللہ کی پیدایش بلاشبہ ایک اعجوبہ تھا۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال کو روکنے کی جو کوششیں کیں وہ زیادہ تر نظری اور علمی نوعیت کی تھیں، یعنی قرآن و حدیث کے علوم و معارف کی تعلیم و اشاعت وغیرہ۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تفہیمات الٰہیہ'' میں 'فك كل نظام' یا دوسرے لفظوں میں غلبۂ اسلام کا جو انقلابی تصور دیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد وجوہ سے وہ کوئی عملی اقدام نہ کر سکے۔ لیکن آگے چل کر ان کی علمی تصانیف نے ایسے اصحاب دل و دماغ پیدا کر دیے جو انقلابی کام کے لیے موزوں تھے۔ سید احمد شہید اور ان کے رفقا کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔

سید احمد شہید نے جس وقت تحریک جہاد شروع کی ہندوستان کے بڑے حصے پر انگریز قابض ہو چکے تھے، صرف چند مقامات تھے جہاں ابھی ان کے اقتدار کی تکمیل باقی تھی۔ انھی مقامات میں سے پنجاب کا صوبہ بھی تھا جہاں سکھ قوم اپنے ایک لیڈر رنجیت سنگھ کی قیادت میں برسر اقتدار تھی۔ سید صاحب کی تحریک جہاد کا رخ اسی گروہ کی طرف تھا۔

اس میدان جہاد کے انتخاب کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پنجاب اور سرحد کے مسلمان سکھوں کے توہین آمیز مظالم، اسلامی شعائر کی بے حرمتی اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ کی وجہ سے سخت ذہنی اور نفسیاتی اذیت میں مبتلا تھے اور کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے۔ چنانچہ سید صاحب نے مسلمانوں کو اس ذلت سے نجات دلانے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے پوری طرح مستعد ہو گئے۔[1]

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھیے: سیرت سید احمد شہید، حصۂ اول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ ۱۹۸۶ء۔

سید صاحب کی غیر معمولی شخصیت، ان کے بعض رفقا بالخصوص مولانا عبدالحئ اور مولانا سید اسماعیل شہید کے علم و فضل اور جوش خطابت کی وجہ سے تحریک جہاد کو نہایت قلیل وقت میں زبردست تائید وحمایت حاصل ہوئی اور مخلص و دین دار مسلمانوں کا ایک جتھا سکھوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق اس جہادی لشکر کا ہر فرد زہد وتقویٰ کے اعتبار سے بلند درجہ رکھتا تھا۔ ''دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جاے نماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے تھے۔[۲]'' اس تحریک کے قائدین بھی علم وتقویٰ کا پیکر اور قرن اول کے مسلمانوں کی پاکیزہ زندگی کا نمونہ تھے۔

لیکن ان تمام روحانی اوصاف ومحاسن کے باوجود تحریک جہاد ناکام ہو گئی۔ متعدد اہل علم نے اس ناکامی سے بحث کی ہے اور اس کے اسباب بیان کیے ہیں۔ لیکن راقم سطور کے خیال میں ناکامی کے بعض وجوہ اب بھی تشنۂ تحریر ہیں۔ عام طور پر مورخین نے تحریک جہاد کی ناکامی کے جو وجوہ بیان کیے ہیں وہ، گو کہ اہم ہیں، زیادہ تر خارجی نوعیت کے ہیں، مثلاً نفاذ شریعت میں تعجیل اور بعض قبائلی رسوم کی مخالفت وغیرہ۔[۳] انھوں نے داخلی اسباب سے بالعموم تعرض نہیں کیا ہے حالاں کہ ان کی تفہیم کے بغیر ناکامی کی صحیح توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اگلی سطروں میں ہم پہلے ناکامی کے خارجی اسباب اور اس کے بعد داخلی اسباب سے بحث کریں گے۔

ابتدا میں سرحدی مسلمانوں نے سید صاحب کا ساتھ اس لیے دیا کہ وہ ان کو عالم، متقی اور خدا ترس سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ سکھوں کے مظالم سے ان کو نجات دلائیں گے۔ گویا انھوں نے سید صاحب کا استقبال امیر جہاد کی حیثیت سے کیا تھا نہ کہ حاکم ریاست کی حیثیت سے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ سید صاحب اس امامت کے بعد صرف کاروبار جہاد کی تنظیم کے مختار بنے تھے، رؤسا وخوانین کے عام امور ریاست سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔[۴]''

لیکن بعد کے واقعات سے، جن میں نفاذ شریعت کا معاملہ بہت اہم ہے، قبائلی سرداروں نے گمان کیا کہ سید صاحب نفاذ شریعت کی آڑ میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ گمان غلط نہ تھا۔ نفاذ شریعت کا صریح مطلب امور ریاست میں مداخلت تھا۔ چنانچہ بیعت امامت کے بعد ان کے مقرر کردہ افراد نہ صرف لوگوں

۲؎ تجدید واحیائے دین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، دارالسلام جمال پور، پٹھان کوٹ پنجاب (چوتھا ایڈیشن) ۷۱۔

۳؎ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، لاہور (آٹھواں ایڈیشن) ۱۹۶۸، ۳۱، ۳۲۔

۴؎ سید احمد شہید حصۂ اول، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۷۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

سے عشر وصول کرتے تھے، بلکہ خلاف شریعت کاموں پر ان کو سزائیں بھی دیتے تھے[5]۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل سرحد کی ایمانی حالت اس وقت شریعت کے اس بار گراں کی متحمل نہ تھی۔ ان کی اکثریت، جن میں سرداران قبائل بھی شامل تھے، احکام شریعت کی تعمیل بالخصوص عشر کی ادائیگی کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ نوا کلئی اور شیخ جانا کے لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ فرماں برداری کے لیے تیار ہیں، لیکن انھیں عشر سے معاف رکھا جائے[6]۔ احمد خان کمال زئی نے بھی اداے عشر سے انکار کیا اور جنگ مروان پیش آئی[7]۔ عشر کے معاملے میں ان کا توحش اس حد تک تھا کہ عنایت اللہ خاں، رئیس الاڈنڈ نے مولانا اسماعیل سے دوران گفتگو میں صاف کہہ دیا کہ ''اگر آپ نے ہم پر عشر نافذ کر دیا تو اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین پر چلے جائیں گے[8]''۔

اس معاملے میں سرحدی علما نے بھی قبائلی سرداروں کا ساتھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عشر اور دوسرے ناموں سے جو تھوڑی بہت رقم نکالی جاتی تھی وہ ملاؤں کو ملتی تھی اور وہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ نفاذ شریعت کے بعد وہ اس کے حق دار نہ تھے کہ عشر ازروے فقہ صرف امام ریاست کا حق ہے[9]۔ مزید براں قبائل میں ایک رسم یہ تھی کہ ایک بھاری رقم لے کر لڑکیوں کی شادی کی جاتی تھی، جس کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں بڑی عمر تک گھروں میں بیٹھی رہ جاتی تھیں[10]۔ یہ رسم دختر فروشی کے مترادف تھی۔ نفاذ شریعت کے ساتھ ہی اس غیر اسلامی رسم کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس حکم کو سرحدی مسلمانوں نے پسند نہیں کیا[11]۔

سید صاحب کے بعض رفقا کا غیر حکیمانہ طرز عمل بھی موجب فتنہ بنا۔ انھوں نے نفاذ شریعت میں تشدد سے کام

---

۵ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۸۶۔

۶ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۱۷۔

۷ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۲۷۔

۸ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۸۸۔

۹ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۱۲، ۲۱۳، مزید دیکھیے: موج کوثر، ۳۰۔

۱۰ سید احمد شہید، حصۂ دوم، غلام رسول مہر، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۲، ۲۱۲، ۲۱۳، مزید دیکھیے: موج کوثر، ۵۶۔

۱۱ رسم دختر فروشی کے خاتمہ کے ساتھ ہی بارہ دن کے اندر بالغ افغان لڑکیوں کی شادی کا حکم دیا گیا۔ (دیکھیے: تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت مؤلفہ: سید ہاشمی فرید آبادی، پاکستان، کراچی ۱۹۵۳ء، ۲۹۷) بہت سی افغان لڑکیاں ہندی مجاہدین سے بھی منسوب ہو گئیں۔ افغانوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کی لڑکیوں کی شادی جبراً اور وہ بھی غیر افغانوں سے ہو۔ دیکھیے: سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۲۸۲، ۲۹۲، ۳۲۶۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لیا۔ باپ دادا کے رسوم پر چلنے والوں کو کافر قرار دیا گیا۔[۱۲] مولوی خیر الدین شیر کوٹی نے سید صاحب سے شکایت کی کہ ''مجھے جس بستی میں اترنے کا اتفاق ہوا وہاں کے لوگوں کو قاضیوں کا شکوہ گزار پایا۔ وہ بعض اوقات معمولی خطاؤں پر زیادہ جرمانہ لیتے ہیں۔''[۱۳]

انھی اسباب سے سرحدی مسلمان بالخصوص اہل سمہ تحریک جہاد کے خلاف ہو گئے اور قاضیوں اور عشر وصول کرنے والوں کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا جو بالآخر تحریک جہاد کی ناکامی پر منتج ہوا۔

ماننا ہوگا کہ نفاذ شریعت ایک عاجلانہ قدم تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایک طویل مدت تک اہل سرحد کی دینی اور اخلاقی تربیت کی جاتی اور خود ان کے علما کو اصلاح معاشرہ کے لیے تیار کیا جاتا۔ سکھوں سے محاذ آرائی کے پیش نظر بھی اس معاملے میں محتاط روش درکار تھی۔ لیکن سید صاحب کے مزاج میں جو عجلت تھی، جس پر تفصیلی گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے، اس نے ان کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور ان سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اس علاقہ کو اس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ ان کا لشکر تو یقیناً بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا۔ مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں ان کی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا تا کہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اس کے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اس لیے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کریں گے۔ اسی وجہ سے انھوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا اور جتنا ملک قابو میں آیا اس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات رکھنا جو اصلی مسلمانوں ہی سے پوری ہو سکتی ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے۔''[۱۴]

۱۲؎ سید احمد شہید، ۲۱۷۔ مزید دیکھیے: موج کوثر، ۳۰۔

۱۳؎ موج کوثر، ۳۱۔

۱۴؎ تجدید و احیائے دین، ۷۵۔ مزید دیکھیے: موج کوثر، ۳۱۔

مولانا کا یہ تبصرہ بالکل صحیح اور حقائق پر مبنی ہے۔ تحریک جہاد کی ناکامی میں جو داخلی اسباب موثر ثابت ہوئے ان میں اتحاد فکر و عمل کا فقدان، عجلت و بے صبری، شخصیت پرستی اور توکل کا غیر قرآنی تصور جیسے عوامل زیادہ اہم ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

اتحاد فکر و عمل کا فقدان

راقم کے نزدیک تحریک جہاد کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ اس میں اتحاد فکر و عمل کا فقدان ہے۔ ایک طرف سکھ تھے جو ایک ہی لیڈر کے زیر قیادت پوری طرح منظم تھے اور ان کا ایک ہی مقصد تھا یعنی سکھ ریاست کا استحکام اور اس کی توسیع۔ اس مقصد کے لیے پوری قوم سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار تھی۔ دوسری طرف مسلمان تھے جن کا کوئی واحد قائد نہیں تھا۔ سید صاحب کی حیثیت بیعت امامت کے بعد زیادہ سے زیادہ امیر جہاد کی تھی۔ سرحدی قبائل کے سرداروں نے انھیں حاکم ریاست کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا، بلکہ امیر جہاد کی حیثیت کو بھی انھوں نے بجبر و اکراہ قبول کیا تھا۔ خود قبائلی سردار باہم شیر و شکر نہ تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ طرفہ ستم یہ کہ سید صاحب کی جماعت بھی پوری طرح متحد نہیں تھی۔ مولوی محبوب علی دہلوی کو سید صاحب کے طرز زندگی پر سخت اعتراض تھا۔ مثلاً یہ کہ ''وہ نفیس لباس پہنتے ہیں، لذیذ کھانا کھاتے ہیں، اس کے برعکس مجاہدین چکیاں چلاتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں اور پاؤ بھر غلہ پاتے ہیں[15]۔''

تحریک جہاد کا مقصد بھی ایک نہ تھا، ہندوستانی مجاہدین بلاشبہ دل سے چاہتے تھے کہ سکھوں کا اقتدار نیست و نابود ہو اور اس کی جگہ مسلم اقتدار قائم ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ نذرانۂ دل و جاں پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن زیادہ تر سرحدی مسلمان اس نیک جذبے سے خالی تھے۔ ان کے مقاصد دنیوی تھے یعنی حصول مال و زر وغیرہ۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جماعتوں اور قوموں کی نفسیات میں بڑی مشابہت ہے۔ ماضی میں جو غلطیاں بعض افراد یا جماعتوں کی طرف سے صادر ہو چکی ہوتی ہیں انھی غلطیوں کو بعد میں آنے والے لوگ مختلف عوامل کے زیر اثر دہرانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ یہی حادثہ پیش آیا۔ سید صاحب کی تحریک جہاد کی ناکامی کا صحیح جائزہ لینے کے باوجود انھوں نے ٹھیک وہ غلطی کی جو تحریک جہاد کے قائدین سے سرزد ہو چکی تھی، یعنی مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے بغیر پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی کوشش۔

15۔ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۲۷۔

www.javedahmadghamidi.com

''اکوڑے اور بازار کی لڑائیوں سے یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اہل سرحد میں نظم و جمعیت قطعاً موجود نہیں اور نہ ان کے سامنے دینی مقاصد ہیں۔ سید صاحب کا ساتھ دیتے، تو اس لیے نہیں کہ ان بلند اغراض کے لیے جان لڑائیں جن کی خاطر سید صاحب رائے بریلی سے نکل کر سرحد پہنچے تھے۔ محض مال کی خاطر معیت اختیار کرتے۔ جب مال مل جاتا تو رزم و پیکار کی ہر مصلحت سے بے پروا ہو کر گھروں کی راہ لیتے۔[16]''

چنانچہ جنگ شیدو میں، جو سکھوں سے پہلی دوبدو جنگ تھی، مسلمانوں کے جماعتی نقائص کھل کر سامنے آ گئے۔ یار محمد خاں، حاکم پشاور نے غداری کی اور سکھوں سے ساز باز کر کے نہ صرف جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا، بلکہ سید صاحب کو کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ انجام کار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور چھ ہزار غازی شہید ہوئے۔[17]

اس بدترین شکست کے بعد بھی مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے احتساب عمل کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی، بلکہ الٹا ان کی صفوں میں مزید انتشار پیدا ہو گیا اور باہم خوں ریزی شروع ہو گئی جس کا سلسلہ مجاہدین کے قتل عام پر ختم ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ان کو عین حالت نماز میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔[18] تحریک جہاد کا یہ ایک دردناک باب ہے۔

عجلت و بے صبری

تحریک جہاد کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ امیر جہاد کی عجلت و بے صبری ہے، جو ان کے مزاج میں پختہ ہو چکی تھی۔ یہ خرابی اگر کسی فرد میں ہو تو اس کے لیے سخت مضرت رساں ہے اور اگر کسی جماعت کے امیر میں ہو تو پھر اس جماعت کی تباہی یقینی ہے۔

مورخین کے بیان کے مطابق سید صاحب اپنے رفقا کے ساتھ ہندوستان سے چل کر پہلے کابل پہنچے اور وہاں سے براہ خیبر پشاور میں داخل ہوئے، پھر وہاں سے نوشہرہ پہنچے۔ اس وقت مجاہدین کی کل تعداد پندرہ سو تھی جن میں پانچ سو ہندوستانی تھے۔[19] ان مجاہدین کی جنگی بے سروسامانی کا حال یہ تھا کہ سب کے پاس بندوقیں بھی نہ تھیں۔[20] سامان حرب کی

۱۶؎ سید احمد شہید، حصۂ اول، ۳۲۷۔

۱۷؎ سید احمد شہید، حصۂ اول، ۴۰۱۔

۱۸؎ موج کوثر، ۳۲۔

۱۹؎ شیخ محمد اکرام نے مجاہدین کی تعداد پانچ سات ہزار لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ دیکھیے: موج کوثر، ۲۵۔

۲۰؎ سید احمد شہید، حصۂ اول، ۳۴۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قلت کے علاوہ مجاہدین دوسری مشکلات سے بھی دوچار تھے۔ ''سردی کا موسم تھا، برف باری ہو رہی تھی اور ان کے پاس نہ رہنے کو مکان تھے، نہ اوڑھنے کو کپڑے، اس کے علاوہ فاقہ کشی ایک اور جاں گداز مصیبت تھی۔ مجاہدین کے پاس کھانے کو کوئی چیز نہ تھی۔ کئی کئی دن فاقے کرتے یا درختوں کی پتیاں ابال کر بھوک کی آگ بجھاتے۔[21]'' ان کے بالمقابل سکھ تھے جن کی تعداد سات سے دس ہزار تک تھی اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس کثیر تعداد میں بندوقوں کے علاوہ آٹھ توپیں بھی تھیں۔[22]

اس ناموافق صورت حال کا لازمی تقاضا تھا کہ سید صاحب مجاہدین کی حالت زار کی طرف توجہ کرتے اور اسلامی لشکر کی حربی اور غیر حربی ضرورتوں کو حتی المقدور پورا کرتے، لیکن ان کی عجلت پسند طبیعت نے ان ضروری امور سے صرف نظر کر لیا اور انجام کار جنگ شیدو میں شکست ہوئی جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

یہی عجلت و بے صبری تھی جو بالاکوٹ کی جنگ میں تحریک جہاد کی فیصلہ کن شکست کی ایک بڑی وجہ ثابت ہوئی۔ اس موقع پر لڑائی کی جو اسکیم باہمی مشورہ سے تیار کی گئی وہ یہ تھی کہ ''سکھ مٹی کوٹ سے اتر کر ٹیلے اور قصبے کے درمیان نشیب میں پہنچیں تو ان پر حملہ کیا جائے، اس نشیب میں زیادہ تر شالی کے کھیت تھے، ان میں رات کو پانی چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ زمین دلدل بن کر زیادہ سے زیادہ ناقابل گزر ہو جائے۔ ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بہترین اسکیم تھی۔ اس لیے کہ سکھ جب اوپر سے اتر کر نشیب میں پہنچ جاتے تو پہلے انھیں دلدل سے سابقہ پڑتا۔ اسے عبور کر لیتے تو پھر قصبے کی سمت میں ان کے سامنے چڑھائی تھی۔ دونوں صورتیں ان کے لیے خطرناک تھیں۔ دلدل میں آگے پیچھے یا دائیں بائیں نقل و حرکت مشکل تھی۔ دلدل سے گزر کر چڑھائی میں ان کے سانس پھول جاتے اور تیزی سے پیش قدمی نہ کر سکتے۔ غازی دلدل سے باہر کھڑے کھڑے ان پر گولیاں برسا سکتے تھے، جو سکھ دلدل سے گزر آتے ان پر چڑھائی کے وقت حملہ کر سکتے تھے۔ اسی اسکیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف جماعتوں کو مناسب مقامات پر مورچہ بندی کا حکم دیا گیا۔[23]''

بالاکوٹ کے محل وقوع کے اعتبار سے یہ ایک بہترین دفاعی اسکیم تھی۔ سید صاحب نے شہادت سے گیارہ دن پہلے نواب محمد وزیر خاں، والی ٹونک کو جو خط لکھا وہ ملاحظہ ہو:

''میں پکھلی کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں، یہاں کے باشندے حسن اخلاق سے پیش آئے اور کاروبار جہاد میں

---

۲۱ موج کوثر، ۲۶، ۲۷۔

۲۲ سید احمد شہید، حصۂ اول، ۳۴۹۔

۲۳ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۸۵۔

اعانت کے پختہ وعدے کیے اور ہمیں قیام کے لیے جگہ دی۔ چنانچہ فی الحال قصبہ بالاکوٹ میں جمعیت خاطر کے ساتھ ٹھہرا ہوں۔ کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس پر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ چونکہ یہ مقام (بالاکوٹ) نہایت محفوظ ہے، لشکر خدا کے فضل سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔[24]''

لیکن قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مذکورہ دفاعی اسکیم کی خلاف ورزی کسی عام مجاہد نے نہیں، بلکہ امیر جہاد سید صاحب نے کی۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''اس پر سب کو تعجب ہوا، اس لیے کہ لڑائی کی جو اسکیم پہلے سے طے ہو چکی تھی وہ یہ تھی کہ جب تک سکھ نشیب میں نہ پہنچ جائیں ان پر حملہ نہ کیا جائے۔ وہ ابھی نشیب سے دور تھے کہ خود سید صاحب نے حملہ کر دیا۔[25]''

یہ حملہ نہیں، خودکشی کا ایک عمل تھا۔ سید صاحب نے رات کے وقت بالاکوٹ کے نشیبی حصے میں، جیسا کہ بیان ہوا، پانی چھڑوا دیا تھا تاکہ وہ دلدل ہو جائے اور سکھوں کے لیے پیش قدمی دشوار ہو۔ لیکن اب وہ اپنے ہی دام میں گرفتار ہو گئے۔ خود ان کے اور ان کے ساتھیوں کے پیر کیچڑ میں پھنس گئے۔ لعل محمد جگدیش پوری کا بیان ہے کہ ''سید صاحب اوپر کی مسجد سے نیچے کی چھوٹی مسجد میں تشریف لائے، تھوڑی دیر ٹھہر کر ہلہ کیا اور تکبیر کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ جن کھیتوں میں رات کو چشمے کا پانی چھڑوایا تھا ان میں جا پہنچے۔ ایک جگہ مینڈ سے آپ کا پاؤں پھسل کر کیچڑ میں جاتا رہا اور اس پاؤں کا جوتا اسی کیچڑ میں رہ گیا۔ میں نے جلد اس کو کیچڑ سے نکال کر حضرت کے پاؤں میں پہنا دیا۔ آپ تو آگے چلے گئے۔ کچھ دور چل کر میرا بھی پاؤں پھسل کر کیچڑ میں چلا گیا۔[26]''

اس عاجلانہ اقدام کے نتیجے میں نہ صرف مجاہدین کو شکست فاش ہوئی، بلکہ تحریک جہاد کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ اسی لڑائی میں سید صاحب کے ساتھ سید اسماعیل صاحب نے بھی جام شہادت نوش کیا۔[27]

شخصیت پرستی

تحریک جہاد کی ناکامی کی تیسری اہم وجہ شخصیت پرستی ہے۔ اس تحریک میں سید صاحب کی حیثیت محض امیر جہاد

---

۲۴ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۷۸۔

۲۵ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۹۴۔

۲۶ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۹۷۔

۲۷ بالاکوٹ کے حادثۂ فاجعہ سے ثابت ہو گیا کہ زہد و تقویٰ، جواں مردی اور خیر خواہی امت جیسے اوصاف کے باوجود سید صاحب کے اندر فوجی قیادت کی صلاحیت کی بے حد کمی تھی۔ ان کے مقابلے میں سید اسماعیل شہید کے اندر یہ وصف بدرجۂ اتم

کی نہ تھی، بلکہ وہ شیخ طریقت یعنی مجاہدین کے پیرومرشد بھی تھے۔ان کی نظروں میں تحریک جہاد اور سید صاحب لازم و ملزوم تھے۔ان کی ذات سے ہٹ کر تحریک جہاد کا کوئی تصور ان کے ذہنوں میں نہ تھا۔ چنانچہ جس وقت بالاکوٹ کی جنگ میں یہ خبر پھیلی کہ سید صاحب شہید ہوگئے ہیں تو مجاہدین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انھوں نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا۔سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

''دوران جنگ میں سید صاحب کی گم شدگی کی خبر سن کر جاں نثار ارادت مندوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بے قرار ہوکر آپ کی تلاش میں سو بہ سو پھرنے لگے۔سکھوں کی گولیاں جو شربت شہادت سے لبریز تھیں، کھا کھا کر رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچتے رہے۔''[۲۸]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''میں اور منشی محمد انصاری پاس پاس کھڑے لڑ رہے تھے۔ اچانک قاضی علاء الدین لڑائی سے دست کش ہوکر حضرت کا حال پوچھتے ہوئے آئے، منشی انصاری نے بھی لڑنا چھوڑ دیا اور حضرت کی تلاش میں بائیں جانب چلے گئے۔اسی حالت میں یہ دونوں بزرگ گولیاں کھا کر شہید ہوگئے۔''[۲۹]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسلام میں اصل اہمیت خدا کے دین اور اس کے قیام واستحکام کو حاصل ہے نہ کہ کسی فرد اور جماعت سے اندھی جذباتی وابستگی۔لیکن آپ نے دیکھا کہ مجاہدین کا لشکر بہت سی خوبیوں کے باوجود اس معاملے میں نقطۂ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔

یہ ٹھیک وہی غلطی تھی جس کا صدور دور رسالت میں جنگ احد کے موقع پر ہوا۔دوران جنگ میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے۔ یہ خبر سن کر صحابہ دل شکستہ ہوگئے اور ان کی ایک جماعت لڑائی سے دست کش ہوگئی۔قرآن میں صحابہ کو ان کی اس غلطی پر متنبہ کیا گیا ہے: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شاکروں کو ضرور بدلہ دے گا۔'' (سورۂ آل عمران ۳: ۱۴۴) لیکن مجاہدین نے قرآن کی اس تنبیہ پر کوئی توجہ نہ دی۔

موجود تھا اور مختلف مواقع جنگ پر اس کا مظاہرہ بھی ہوا۔اگر اسلامی لشکر کی زمام انتظام ان کے ہاتھ میں ہوتی تو عجب نہیں کہ جنگ بالاکوٹ کا نقشہ کچھ دوسرا ہوتا۔

[۲۸] سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۴۱۷۔

[۲۹] سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۴۲۳۔

توکل کا غیر قرآنی تصور

تحریک کی ناکامی کا چوتھا اہم سبب توکل کا غیر قرآنی تصور ہے۔ صوفیا کی جماعت نے اس معاملے میں ہر دور میں بے اعتدالی کا مظاہرہ کیا ہے۔[30] قرآن مجید میں صاف لفظوں میں توکل اور تدبیر کے التزام کی تلقین کی گئی ہے۔ عین حالت جنگ میں صحابہ کو نماز با جماعت کی ادائیگی کا حکم دیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اسلحے لیے رہیں کہ مبادا کفار ان کو غافل پا کر حملہ کر دیں۔ (سورۂ نساء ۴:۱۰۲) تدبیر اور توکل میں جو لطیف ربط ہے اس کا ذکر قرآن مجید کی ایک دوسری سورہ میں اس طرح ہوا ہے:

> ''اور اس نے کہا، تم سب ایک ہی دروازے سے (شہر میں) داخل نہ ہونا، بلکہ متفرق دروازوں سے جانا۔ میں اللہ کے فیصلہ کے مقابلے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ فیصلہ کرنا بس اللہ کا کام ہے (اس ظاہری تدبیر کے باوجود) میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور بھروسا کرنے والوں کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' (سورۂ یوسف ۱۲:۶۷)

اس آیت کے مطابق اللہ کے ایک پیغمبر یعنی یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب وہ غلہ لینے کے لیے مصر میں داخل ہوں تو کس تدبیر سے داخل ہوں۔ لیکن اس تعلیم کے فوراً بعد یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اس تدبیر سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اللہ کے کسی فیصلہ کو ٹال سکتا ہوں۔ انسان صرف تدبیر کا مکلّف ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس خوب صورتی سے اللہ کے اس پیغمبر نے تدبیر اور توکل کے باہمی ربط کی وضاحت کی ہے اس سے بہتر اس کی وضاحت ممکن نہیں ہے۔[31]

مقام حیرت ہے کہ قرآن مجید کی اس تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں سید صاحب نے بالاکوٹ کی جنگ میں تدبیر سے بے اعتنائی دکھائی۔ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر سید صاحب چاہتے تو بالاکوٹ میں سکھوں کے نرغے سے بچ کر نکل سکتے تھے۔ مثلاً وہ پہاڑوں پر چلے جاتے۔ بعض مخلصوں نے، جن میں ناصر خاں اور حبیب اللہ خاں قابل ذکر ہیں، اس کا مشورہ بھی دیا۔[32] یہ بھی ممکن تھا کہ پل پر سے گزر کر مشرقی کنارے پر

---

[30] توحید کا قرآنی تصور، الطاف احمد اعظمی، مطبوعہ دہلی ۱۹۹۰ء، ۱۶۵۔۱۶۸، مزید دیکھیے: راقم ہی کی کتاب: وحدۃ الوجود، ایک غیر اسلامی نظریہ، باب اول۔

[31] توحید کا قرآنی تصور، ۱۷۵، ۱۷۸۔

[32] سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۸۱۔

ناصر خاں نے سید صاحب کو مشورہ دیا کہ پیچھے پہاڑ پر چلا جانا بہتر ہے۔ اس کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا ''خان بھائی! آپ کہتے تو سچ ہیں، لیکن اب کفار کے ساتھ یہیں لڑیں گے۔'' (سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۸۱)

چلے جاتے یا وادی کاغان میں جا ٹھہرتے، جہاں کے سادات حمایت کے لیے تیار تھے۔[۳۳] لیکن سید صاحب نے ان تمام مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور خود کو مع لشکر دیدہ و دانستہ ہلاکت میں ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب ان کے ایک معتقد کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''بالاکوٹ آتے وقت پہاڑ پر ٹھہر گئے تھے اور رات کے وقت دیر تک درختوں کے جھنڈ میں رہے تھے تو اسی وقت سے طبیعت میں ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ تدابیر پر بہت کم توجہ دیتے تھے، زیادہ تر تقدیر پر توکل و اعتماد کے کلمات زبان پر جاری رہتے تھے۔''[۳۴]

اس جواب سے توکل اور تدبیر کی بے ربطی صاف ظاہر ہے، اور یہ خیال قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ کوئی فرد، خواہ وہ کتنا ہی متقی ہو، خدا کی سنت کی خلاف ورزی کر کے اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتا ہے اور سید صاحب کو بھی یہ جرعۂ تلخ پینا پڑا۔ چونکہ سید صاحب امیر جہاد تھے، اس لیے ان کی بے تدبیری کے نتائج بد سے مجاہدین کی جماعت کو بھی دوچار ہونا پڑا۔

متذکرہ بالا اسباب و حقائق کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو تحریک جہاد کی ناکامی پر کوئی تعجب نہ ہو گا۔ اگر نتیجہ اس کے برعکس نکلتا تو اس کو معجزہ ہی کہا جاتا۔ خدا کی اس دنیا میں، جو حکیمانہ سلسلۂ اسباب سے مربوط ہے، ضروری اسباب و تدابیر سے چشم پوشی کر کے کامیابی کی امید رکھنا دراصل زمین شور سے روئیدگی کی توقع رکھنے کے مترادف ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۳۳۔ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۸۳۔

۳۴۔ سید احمد شہید، حصۂ دوم، ۳۸۳۔

خالد مسعود

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر

[جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب]

—— ۳ ——

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی آمد کا خاص مقصد یہ بتایا کہ مجھے لوگوں کو نبی موعود کی آمد کی نوید سنانا ہے۔ آپ کی کتاب کا عنوان انجیل ہے جس کے معنی خوش خبری کے ہیں۔ عیسائی اس خوش خبری کا مصداق خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں، حالانکہ ایسا ماننے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اس کے نمایاں وجوہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ اگر حضرت یحییٰ کی بشارت اور اپنی خوش خبری کا مصداق سیدنا مسیح خود ہوتے تو شہروں میں ان کی منادی ان الفاظ میں ہوتی کہ آسمان کی بادشاہی آ چکی۔ اب تمھیں انتظار کس کا ہے، ایمان لاؤ۔

ب۔ جب حضرت یحییٰ قید خانہ میں تھے اور انھوں نے سیدنا مسیح کی تبلیغ کی شہرت سنی تو انھوں نے پیغام بھیج کر حقیقت معلوم کی۔ اس کے جواب میں حضرت مسیح نے اس بات کی تردید فرمائی کہ آپ ہی موعود نبی ہیں:

> ''یوحنا نے قید خانہ سے پچھوا بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں تو جواب بھجوایا کہ غریبوں کو خوش خبری سنائی جا رہی ہے اور مبارک وہ ہے جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے۔'' (متی ۱۱: ۴۔ ۶)

اس اقتباس میں ''آنے والا'' سے مراد وہ خاص پیغمبر ہے جس کی آمد کی اطلاع انبیاے بنی اسرائیل مسلسل دیتے آئے اور جس پر ایمان لانے کا عہد بنی اسرائیل کوہ طور کے دامن میں کر چکے تھے۔ غریبوں کو جو خوش خبری سنائی جا رہی تھی، وہ آسمانی بادشاہت کے نزدیک آنے کی تھی۔ غریب سے مراد اللہ کے آگے عاجزی و فروتنی کا اظہار کرنے

والے لوگ ہیں جن کے متعلق مسیح علیہ السلام کا قول یہ ہے کہ ''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہی انھی کی ہے''۔ (متی ۵: ۳) دوسرے الفاظ میں مغرور اور ہٹ دھرم لوگ اس بادشاہی میں شامل ہونے سے محروم رہیں گے۔

اوپر کے اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یحیٰی خود جس پیغمبر کی آمد کی خوش خبری دیتے رہے تھے، اسی کی آمد کی بابت انھوں نے حضرت مسیح سے پچھوایا کہ کیا وہی موعود پیغمبر ہیں۔ آں جناب نے واضح الفاظ میں جواب بھجوایا کہ میں تو خود اس کی آمد کی خوش خبری سنا رہا ہوں۔ میری ذات کے بارے میں کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہوا کہ موعود پیغمبر میں نہیں، میرے بعد آنے والا ہے۔

ج۔ حضرت مسیح مدۃ العمر یہ نوید خود بھی سناتے رہے اور آخر میں اپنے خلفا کو بھی اس بات کی تلقین فرمائی کہ میرے بعد اسی مشن کی تکمیل تم کرنا۔ آپ نے فرمایا:

> ''اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔'' (متی ۱۰: ۷۔۸)

یہ تمام قرائن اس کے حق میں ہیں کہ حضرت مسیح کی بعثت کا مقصد اپنے بعد آنے والے اس نبی کی راہ ہموار کرنا تھا جس کی نوید پچھلے انبیا بھی سناتے رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو خبردار کیا کہ جس خاص پیغمبر کا تمھیں انتظار تھا، اب اس کی آمد کا وقت نزدیک آ چکا ہے۔ میرے بعد اس کی آمد کا انتظار کرو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

آسمانی بادشاہت کی حقیقت تمثیلات کی روشنی میں

متی باب ۱۳ میں متعدد تمثیلات کے ذریعے سے سیدنا مسیح علیہ السلام نے آسمانی بادشاہت کی حقیقت سمجھائی۔ فی الواقع ان تمثیلات میں پیغمبر موعود کی رسالت کی خصوصیات سمو دی گئی ہیں۔ بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں:

ا۔ آسمانی بادشاہت رائی کے دانہ کی طرح ہو گی جو بہت چھوٹا ہوتا ہے، لیکن جب اگتا ہے تو بڑھتے بڑھتے اس قدر تناور درخت بن جاتا ہے کہ اس کی ڈالیوں پر پرندے بسیرا کرتے ہیں۔ یا اس کی مثال وہ خمیر ہے جو ایک عورت ذرا سی مقدار میں بہت سے آٹے میں ملا دیتی ہے تو کچھ دیر بعد تمام آٹے میں خمیر اٹھ چکا ہوتا ہے۔ یعنی نبی موعود اپنی دعوت کا آغاز کریں گے تو وہ تنہا ہوں گے۔ اس کے بعد لوگ ان کے ہم نوا بنتے جائیں گے، ان کا قافلہ بڑھتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ ان کی تعلیم کی روشنی سے پورا ملک جگمگا اٹھے گا۔ ہوتے ہوتے کئی دوسری اقوام اسی کی نام لیوا ہو جائیں گی اور اسی کی پناہ میں آسودگی پائیں گی۔

ب۔ آسمانی بادشاہت کھیت میں چھپے کسی خزانے کی طرح ہے جس پر اگر کوئی شخص مطلع ہو جائے تو اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جائداد بیچ کر اس کھیت ہی کو خرید لیتا ہے۔ یا اس کی تمثیل یوں ہے جیسے عمدہ موتیوں کا کوئی سوداگر جب اپنی پسند کا بیش قیمت موتی کہیں دیکھ لیتا ہے تو اس کو حاصل کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ بیچ دیتا ہے۔ یعنی نبی موعود کی دعوت کی قدر و قیمت سے جو شخص واقف ہو جائے گا، وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کسی چھوٹی یا بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ وہ مال و جان کو عزیز نہیں رکھے گا، بلکہ دعوت کی خاطر جان لڑا دینے کو اپنی سعادت سمجھے گا۔

ج۔ آسمانی بادشاہت اس بڑے جال کی مانند ہوگی جو دریا میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی مچھلیاں سمیٹ لی جاتی ہیں۔ اس کے بعد دریا کے کنارے پر لا کر اچھی مچھلیاں الگ کر لی جاتی ہیں اور خراب پھینک دی جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اچھے بیج کے ساتھ کچھ خراب بیج بھی کھیت میں پڑ جاتا ہے تو کسان اس کو اگنے اور بڑھنے دیتا ہے۔ جب فصل کٹتی ہے تو خراب بیج کے پودوں کو الگ جمع کر کے آگ لگا دی جاتی ہے اور اچھے بیجوں کی فصل کو سمیٹ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ موعود نبی کی رسالت میں مومن و منافق جمع ہو جائیں گے تو منافقوں کو برداشت کیا جائے گا اور ان پر فوری گرفت نہیں ہوگی۔ بعد کے مراحل میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا جس سے ان میں اور خالص و مخلص اہل ایمان میں امتیاز ہو جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

یہود کو تنبیہ

سیدنا مسیح علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل کی اصلاح پر مامور تھے، اس لیے انھوں نے اپنی قوم کو خاص طور پر متنبہ کیا کہ ان کا ماضی کا رویہ ایسا ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت خداوندی کی حامل قوم کی حیثیت سے کام کرنے کا مزید موقع نہیں دے گا اور یہ تاج ان لوگوں کو پہنایا جائے گا جو اس کی ذمہ داریوں کا حق ادا کرنے والے ہوں۔ آپ نے فرمایا:

> ''میں تم سے کہتا ہوں کہ بہتیرے پورب اور پچھّم سے آ کر ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہی کی ضیافت میں شریک ہوں گے، مگر بادشاہی کے بیٹے باہر اندھیرے میں ڈالے جائیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔'' (متی ۸: ۱۲۔۱۳)

اس قول کا مفہوم نہایت واضح طور پر یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی کتنی قومیں نبی آخر الزمان پر ایمان لا کر اپنے آپ

کو اخروی ضیافت کا مستحق بنالیں گی، لیکن بنی اسرائیل جس ڈگر پر چل رہے ہیں، اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ پیغمبروں کی اولاد ہونے کے باوجود ایمان سے محروم رہ کر ابدی خسران کے مستحق ٹھہریں گے۔ ایسا کیوں ہوگا اور بنی اسرائیل سے خلعت نبوت کیوں چھین لی جائے گی، اس کو سیدنا مسیح نے تاکستان کی مشہور تمثیل سے واضح فرمایا:

یہ تمثیل یوں ہے کہ ایک مالک نے تاکستان یعنی انگوروں کا باغ لگایا۔ وہ اسے باغ بانوں کو ٹھیکے پر دے کر پردیس چلا گیا۔ پھل کا موسم آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو پھل لانے کے لیے بھیجا۔ باغ بانوں نے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا، کسی کو پتھر مارے اور کسی کو قتل کر دیا۔ مالک نے پہلے سے زیادہ نوکر بھیجے۔ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ بالآخر مالک نے اپنے بیٹے کو بھیجا تو باغ بانوں نے اس کو بھی قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مالک ان باغ بانوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ دوسروں کو دے دے گا جو موسم پر اس کو پھل پیش کریں۔ تمثیل سنا کر سیدنا مسیح نے فرمایا:

''کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ:

جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظر میں عجیب ہے

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو، جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا۔''

(متی ۲۱: ۴۲۔۴۴)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تاکستان کی تمثیل میں بنی اسرائیل کے جرائم سے پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو برگزیدہ کیا، لیکن وہ اس کے عہد کو پورا نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب متعدد نبی مبعوث کیے، لیکن انھوں نے ان کی تحقیر کی، بعض کو سنگ سار اور بعض کو قتل کر دیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک عظیم رسول ـــــ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ـــــ کو مبعوث فرمایا تو انھوں نے اس کے قتل کی بھی تدبیر کی۔ اس شیطنت کے بعد آخر اللہ تعالیٰ اس نا ہنجار قوم کو اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے کیوں مسلط رکھے گا۔ وہ لازماً اس ذمہ داری کو دوسروں کے سپرد کر دے گا جو اس کا حق ادا کر سکیں۔

سیدنا مسیح علیہ السلام نے کتاب مقدس کا جو حوالہ دیا یہ اصل میں زبور ۱۱۸: ۲۲۔۲۳ کی عبارت ہے جس کی وضاحت حضرت داؤد کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے۔ اسی کی تفسیر آں جناب نے آگے کی ہے۔ معماروں کے اس پتھر

کورد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ہمیشہ اپنے بھائیوں ـــــ بنی اسماعیل ـــــ کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے اندر کسی خوبی کا اعتراف نہیں کیا۔ لہٰذا بنی اسماعیل کے اندر آخری پیغمبر کی بعثت بنی اسرائیل کو ہکا بکا کر دے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہو گا۔ بنی اسرائیل اگر اس پیغمبر سے ٹکرائیں گے تو اپنا سر پھوڑیں گے۔ اس کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔

جب سیدنا مسیح سے یہود بے زار ہو گئے تو انھوں نے ان کو رومی حکومت کے ہاتھوں قتل کرانے کی سازش تیار کی۔ جب آں جناب اس سے مطلع ہوئے تو اپنی ناہنجار قوم کو آخری مرتبہ یوں جھنجھوڑا:

''اے یروشلم، اے یروشلم، تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگ سار کرتی ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے، اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں، مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو تمھارا گھر تمھارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے، کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے، جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔'' (متی ۲۳: ۳۸۔۳۹)

یہاں حضرت مسیح یہود کو خدا کی لعنت سے بچانے کے لیے اپنی کاوشوں کا ذکر کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہود نے ان کی قدر نہیں کی، لہٰذا اب ان سے نبوت کا منصب ہمیشہ کے لیے چھین لیا جائے گا۔ اب ان میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہو گا۔ ان کی فلاح کی واحد صورت اب یہ ہے کہ اس نبی موعود پر ایمان لائیں جو خداوند کے نام سے آئے گا۔

یہود سے مایوس ہو کر سیدنا مسیح نے اپنے شاگردوں کو ملک میں پھیل جانے کا حکم دیا کہ وہ بستیوں میں گھوم پھر کر صحیح دین کی منادی کریں۔ بے حد مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ لوگ اصل دین کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہودیوں نے اپنی سرشت کے مطابق حضرت مسیح کی تعلیم میں تحریف کا منصوبہ بنایا اور حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا اور خدائی کے تین ستونوں میں سے ایک ستون قرار دے کر خدا بنا ڈالا۔ پال نے یہ عقائد مسیح کے پیروکاروں میں پھیلائے تو ان کی اکثریت نے ان کو قبول کر لیا اور خالص دین مسیحی کے حاملین اقلیت میں ہو گئے۔ پال کے ماننے والے رومی سلطنت میں بااثر ہو گئے اور آہستہ آہستہ حکمران طبقہ عیسائی ہو گیا۔ اس طرح بحیثیت مجموعی یہود اور نصاریٰ، جنھیں کتاب اللہ کی وراثت سونپی گئی تھی، دونوں اصل دین توحید کے خادم اور مبلغ کے طور پر ناکام ہو گئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سیدنا مسیح نے اپنے بعد اس نبی کے آنے کی اطلاع دی جس سے یہود پہلے سے واقف تھے اور جس کے انتظار کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے پیش رو انبیا و رسل کی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی اس رسول کی کئی علامات و خصوصیات بیان کیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔''

(یوحنا۱۴: ۳۰)

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔'' (یوحنا۱۶: ۷۔۸)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو کامل سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔'' (یوحنا۱۶: ۱۲۔۱۳)

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا، تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔'' (یوحنا۱۴: ۱۶۔۱۷)

ان اقتباسات سے حسب ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ آنے والے پیغمبر کا مرتبہ و مقام سب سے اونچا ہے۔ حضرت عیسیٰ بھی اس کے ہم پلہ نہیں۔

۲۔ اس کے پاس کامل سچائی یا مکمل حق ہو گا۔ یعنی جو تعلیم دے گا، وہ آسمانی ہدایت کی تکمیل کرے گی، جبکہ سابق انبیا کے پاس نا تمام ہدایت تھی۔

۳۔ اس کی تعلیم ابد تک باقی رہے گی، یعنی وہ آخری نبی ہو گا اور اس کے پاس جو ہدایت ہو گی، وہ اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک دنیا آباد ہے۔

۴۔ وہ پیغمبر آسمانی تعلیم ہی پیش کرے گا اور مستقبل کے بارے میں واضح اشارات دے گا۔

۵۔ وہ اپنے مخاطبوں کے اندر پائے جانے والے گناہوں، حق تلفیوں اور غلطیوں کی نشان دہی کرے گا اور ان کو اس کا الزام دے گا۔

۶۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اب وہی پیغمبر مبعوث ہو گا۔ درمیانی زمانہ میں کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

۷۔ حضرت عیسیٰ نے اس پیغمبر کا نام بھی بتایا جس کو مترجموں نے مددگار یا سچائی کا روح کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ حالانکہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ قرآن نے جہاں حضرت عیسیٰ کے بتائے ہوئے نام کا ذکر لیا، وہاں نام 'احمد' بتایا ہے۔

بنی اسرائیل کے انبیا و رسل نے جس وضاحت سے نبی موعود کا ذکر کیا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علیہ السلام کی دعا کی روشنی میں اپنے قبیلوں کو ہر دور میں تیار کرتے رہے کہ جوں ہی اس نبی کی بعثت ہو، وہ اس پر ایمان لانے میں تاخیر نہ کریں اوراس کے دست و بازو بن کراس کے فرائض کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کریں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اہل کتاب ہر دور میں اس آخری نبی کی آمد کے منتظر رہے اور اپنے ہم عصروں کو بھی ذہنی طور پر تیار کرتے رہے کہ وہ بھی اس عظیم رسول کو پہچاننے اوراس پر ایمان لانے میں پیچھے نہ رہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

—— ۴ ——

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مسیلمہ ۹ھ میں بنو حنیفہ کے ایک وفد کے ساتھ مدینہ آیا۔ وفد کے ارکان نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا، مسیلمہ سامان کی حفاظت پر مامور تھا، آپ کے پاس نہ پہنچا، لیکن بظاہر مسلمان ہو گیا۔ آپ نے بھی اس کے لیے کچھ مال بھجوایا۔ وطن واپس جا کر اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور من گھڑت الہامات سنانے لگا پھر اس نے آپ کو خط لکھا کہ مجھے بھی اپنی نبوت میں شریک کر لیں یا یہ منصب مجھے منتقل کر دیں۔ آپ نے اسے جھوٹا قرار دیا، قبل اس کے کہ آپ اس کے خلاف کسی کارروائی کا حکم فرماتے، آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یمامہ کا ایک شخص نہار الرجال بن عنفوہ بھی اس سے مل گیا جس نے مدینہ میں قیام کر کے قرآن مجید اور اسلام کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اہل یمامہ کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے بھیجا، لیکن وہ الٹا مسیلمہ سے مل گیا اور آپ سے جھوٹا قول منسوب کر دیا کہ مسیلمہ شریک نبوت ہے۔ یمامہ والے اس کے دھوکے میں آ گئے اور ہزاروں لوگ اس جھوٹے نبی پر ایمان لے آئے۔ تاریخ میں مسیلمہ کا کوئی معجزہ مذکور نہیں۔ قبائلی عصبیت نے اس کے گرد جھرمٹ اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ طلحہ نمری نے گواہی دی: ''مسیلمہ، تم کذاب ہو اور محمد سچے ہیں، لیکن ہمیں اپنا کذاب دوسروں کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔'' چنانچہ وہ مسیلمہ کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

جنگ یمامہ ربیع الاول ۱۲ھ (مئی ۶۳۳ء) میں عقربا کے مقام پر لڑی گئی، جہاں مسیلمہ لشکر کش تھا۔ چالیس ہزار پر مشتمل مسیلمہ کا لشکر اسلامی لشکر سے کئی گنا بڑا تھا، اس لیے ابوبکر نے خالد کے لشکر کے برابر ایک اور کمک بھیجی۔ ان کی

پالیسی تھی کہ اہل بدر کو جنگوں میں نہ بھیجا جائے، لیکن اس نازک موقع پر انھوں نے بدری صحابہ کا ایک دستہ اور حفاظ کی بڑی تعداد بھی اس لشکر میں شامل کی۔ انصار کی کمان ثابت بن قیس اور برا بن مالک کے پاس تھی، جبکہ ابوحذیفہ بن عتبہ اور زید بن خطاب مہاجرین کی سربراہی سنبھالے ہوئے تھے۔ خالد سے پہلے عکرمہ اور شرحبیل مسیلمہ سے شکست کھا چکے تھے، کیونکہ وہ مسیلمہ کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر اس سے بھڑ گئے تھے۔ ابوبکر نے عکرمہ کو تو عمان اور اس کے بعد یمن بھیج دیا، لیکن شرحبیل کو وہیں رکنے کی ہدایت کی۔ خالد نے بطاح سے یمامہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، ثنیۃ الیمامہ کے مقام پر انھیں بنوحنیفہ کا ایک سردار مجاعہ ایک شب خون مارنے والے دستے کے ساتھ ملا۔ انھوں نے اس کے ساتھیوں کو توقتل کرا دیا، لیکن اسے بیڑیوں میں جکڑ کر قید کر لیا۔ دوسرے دن فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مسیلمہ کے بیٹے شرحبیل نے اپنی فوج کو خوب جوش دلایا اور بھڑکایا: ''اے بنوحنیفہ، اگر تم شکست کھا گئے تو تمھاری عورتیں لونڈیاں بنا لی جائیں گی، اپنے حسب ونسب کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کرو۔'' بدقسمتی سے انصار، مہاجرین اور بدووں میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ان میں زیادہ دلیر کون ہے؟ اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمامہ کا لشکر ان پر چڑھ دوڑا اور یہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ خالد نے مسلمان لشکر کو الگ گروہوں میں بانٹ کر کہا: ''ہم دیکھیں گے کہ کس نے زیادہ دلیری کا مظاہرہ کیا ہے؟'' سب سے پہلے مسیلمہ کا دست راست نہار الرجال مارا گیا اور مسلمانوں میں سے ثابت بن قیس، زید بن خطاب، ابوحذیفہ اور ان کے غلام سالم نے جام شہادت نوش کیا۔ خالد نے دیکھا کہ مسیلمہ کے ساتھی اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں اور اس کی حفاظت میں موت کی پروا نہیں کر رہے تو انھوں نے اسے قتل کرنے کی ٹھانی تاکہ جنگ کا جلد خاتمہ ہو۔ جب خالد نے اس کے جلو میں کھڑے ہوئے بے شمار لوگوں کو مار ڈالا تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے تعمیر کردہ بلند فصیلوں والے حدیقۃ الرحمان میں داخل ہو گیا، اس کی قوم بنوحنیفہ بھی اس کے ساتھ اس باغ میں پناہ گزین ہو گئی۔ اسلامی فوج نے باغ کے گرد پڑاؤ ڈال دیا، کوشش کے باوجود کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں سے شگاف کیا جا سکتا تو برا بن مالک نے کہا: ''مجھے اٹھا کر اندر پھینک دو، میں دروازہ اندر سے کھول دوں گا۔'' ان کے اصرار پر انھیں پھینکا گیا تو دروازہ کھلا۔ بنوحنیفہ کے لاتعداد افراد تہ تیغ ہوئے تو بہت سے مسلمان بھی شہید ہوئے۔ مقتولوں کی کثرت سے باغ ایک مذبح کا منظر پیش کر رہا تھا اسی وجہ سے یہ حدیقۃ الموت کہلایا۔ جنگ احد میں سید الشہدا حمزہ کو شہید کرنے والے اور فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والے وحشی نے مسیلمہ کو دیکھا تو تاک کر اسے نیزہ مارا، یوں وہ کذاب جہنم واصل ہوا۔ اس دوران میں ایک انصاری بھی اس پر تلوار کا وار کر چکے تھے۔ باقی مفروروں کو پکڑنے کے بعد خالد نے بنوحنیفہ کے قلعہ بندوں سے صلح کی۔ مجاعہ نے ان سے دھوکا کیا اور قلعوں میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بنو عورتوں اور بچوں کو جنگجو مرد ظاہر کر کے پون مال اسباب، باغات اور قیدیوں کو چھڑا لیا۔ اسی اثنا میں ابوبکر کا قاصد پیغام لایا کہ لڑائی کے قابل سب مردوں کو قتل کر دیا جائے، لیکن خالد نے صلح برقرار رکھی اور بنو حنیفہ نے نئے سرے سے بیعت اسلام کی۔ جنگ یمامہ میں یمامہ کے ۲۱ ہزار آدمی مارے گئے، جبکہ مسلمان شہدا کی تعداد ۱۲ سو تھی، ان میں ۳۶۰ مدینہ میں رہنے والے مہاجرین وانصار اور ۳۰۰ دوسرے شہروں کے مہاجرین تھے۔ ابوبکر نے کثیر تعداد میں حفاظ کے شہید ہو جانے کے بعد قرآن مجید جمع کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس معرکے سے فارغ ہونے کے بعد خالد نے مجاعہ کی بیٹی سے شادی کی تو ابوبکر بہت ناراض ہوئے۔

اب جنوبی قبائل کی بغاوت فرو کرنے کی باری تھی۔ نصف عرب پر محیط یہ لق ودق صحرا بحرین، عمان، مہرہ، حضر موت، کندہ اور یمن کے صوبوں پر مشتمل ہے اور ربع الخالی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایران کا بہت اثر تھا، خسرو کے عامل بدھان کے قبول اسلام تک یمن ایران کی عمل داری میں تھا۔ ابھی خالد یمامہ میں تھے کہ ماتحت سپہ سالاروں کو ان قبائل کی طرف بھیج دیا۔ بحرین نزدیک تھا، اس لیے یہاں سے آغاز کیا گیا۔ یہاں کا عیسائی بادشاہ منذر بن ساوی ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد علا بن حضرمی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ اتفاق سے جب آں حضرت نے وفات پائی اسی ماہ منذر کا انتقال بھی ہو گیا۔ بحرین والے مرتد ہو گئے، صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ جارود بن معلیٰ اسلام پر برقرار رہے۔ انھوں نے اپنے قبیلے عبدالقیس کو پھر سے اسلام پر آمادہ کر لیا، لیکن بحرین کے دوسرے قبائل حطم بن ضبیعہ کی سربراہی میں ارتداد پر قائم رہے۔ اس نے ہجر اور قطیف میں مقیم غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کو ساتھ ملا کر بنو عبدالقیس کا محاصرہ کر لیا۔ بھوک اور پیاس سے جاں بلب ہونے کے باوجود بنو عبدالقیس پھر مرتد نہ ہوئے۔ ابوبکر نے علا بن حضرمی کو بحرین کے مرتدین کے مقابلے کے لیے بھیجا، وہ یمامہ کے پاس سے گزرے تو نئے سرے سے مسلمان ہونے والے بنو حنیفہ کی کثیر جمعیت ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ قیس بن عاصم نے جو زکوٰۃ کا انکار کرنے میں پیش پیش تھے، اپنے قبیلے سے زکوٰۃ اکٹھی کر کے علا کو پیش کی۔ علا محاذ جنگ پر پہنچے تو انھوں نے مرتدین کی بھاری تعداد دیکھتے ہوئے اسلامی لشکر کے گرد خندق کھدوائی اور پڑاؤ ڈال دیا۔ کبھی کبھار وہ خندق عبور کر کے مرتدین پر حملہ کرتے اور پھر واپس آ جاتے۔ ایک ماہ اسی طرح گزر گیا، ایک رات جب مشرکین شراب میں دھت غوغا کر رہے تھے علا پیش قدمی کر کے ان کے علاقے میں گھس گئے اور ان کو تہس نہس کر دیا۔ بے شمار قتل ہوئے اور ہزاروں کو قیدی بنا لیا گیا، قیس بن عاصم نے حطم کا کام تمام کیا۔ کچھ فرار ہو کر چند میل دور خلیج فارس میں واقع جزیرہ دارین جا پہنچے۔ مسلمانوں کے پاس کشتیاں نہ تھیں، انھوں نے گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں ہی کو سمندر میں ڈال دیا اور دارین

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پہنچ گئے۔ مفروروں کا قلع قمع کرنے کے بعد واپس بحرین آئے تو علا نے ابوبکر کو فتح کی خوش خبری بھیجی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عمان پر ایران کی طرف سے جیفر نامی عامل مقرر تھا۔ آپ نے اس کی طرف عمرو بن عاص کو اسلام کا پیغام دے کر بھیجا، اسے زکوٰۃ مدینہ بھیجنے پر اعتراض تھا۔ عمرو نے زکوٰۃ اسی کے علاقے میں خرچ کرنے کی تجویز پیش کی تو وہ مسلمان ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد مدعی نبوت لقیط بن مالک کی تحریک پر اہل عمان مرتد ہوئے تو جیفر پہاڑوں پر بھاگ گیا۔ ابوبکر نے حمیر سے حذیفہ بن محصن کو عمان بھیجا۔ آپ کی ہدایت پر یمامہ سے عکرمہ بن ابوجہل اور شرحبیل بن حسنہ بھی آ گئے۔ جیفر اور اس کے بھائی عباد کو پیغام بھیجا گیا کہ آ کر اسلامی لشکر سے مل جائیں۔ دبا کے مقام پر شدید لڑائی ہوئی، ابتدا میں لقیط کا پلہ بھاری تھا، لیکن عبدالقیس اور دوسرے قبائل کی طرف سے کمک پہنچی تو جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ غنیم کے ۱۰ ہزار آدمی مارے گئے، بہت سے قید ہوئے اور کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔

عکرمہ بھاری جمعیت لے کر مہرہ پہنچے، وہاں دو حریفوں میں اقتدار کی کشمکش چل رہی تھی۔ انھوں نے کمزور فریق کو اسلام کی دعوت دی پھر ان نومسلموں کو اپنے ساتھ ملا کر طاقت ور گروہ پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ عکرمہ نے فتح کی خوش خبری اور خمس بھیجنے کے ساتھ حلیف جماعت کے سربراہ کو بھی ابوبکر کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا۔ اب وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے یمن کی طرف بڑھے۔

یمن کی بغاوت کا پہلا سبب وہاں کسی مرکزی حکومت کا موجود نہ ہونا تھا۔ بازان کے بیٹے شہر اور دوسرے عمال میں منقسم حکومت مدعی نبوت اسود عنسی کے جانشینوں کی سازشوں کے سامنے نہ ٹھہر سکتی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اٹھنے والی ارتداد کی لہر نے بھی اثر دکھایا۔ اس بغاوت کا دوسرا سبب نسلی تھا، ابوبکر نے شہر بن بازان کے قتل کے بعد ایرانی النسل فیروز کو صنعا کا حاکم مقرر کیا، اس لیے عربی النسل قیس حمیری اس کا مخالف ہو گیا۔ دوسری طرف مدینہ سے یمن کو جانے والے راستے پر آباد عک اور اشعر قبائل نے مسلمانوں کے لیے یہ راستہ مسدود کر دیا تھا۔ طائف کے حاکم طاہر بن ابو ہالہ نے ابوبکر کی اجازت سے ان قبائل سے ایک خوں ریز جنگ کے بعد اس طریق الاخابث کو مسلمانوں کے لیے وا کر دیا۔ قیس نے یمن میں مقیم ایرانی نسل کے باشندوں کے خلاف جنھیں انبا کہا جاتا تھا عرب قبائل کو ابھارا۔ ذوالکلاع حمیری نے اس کا ساتھ نہ دیا تو اس نے اسود عنسی کے قتل میں شامل باقی عرب سرداروں سے رابطے کیے اور انتہائی خفیہ طور پر فوج ترتیب دے کر صنعا پر حملہ کرا دیا۔ خود وہ صنعا میں رہا، اس نے فیروز اور اس کے دو ساتھیوں داذویہ اور جشنس کو قتل کے ارادے سے اپنے گھر بلایا، داذویہ کے قتل میں وہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کامیاب ہو گیا، لیکن فیروز اور جشنس بھاگ نکلے۔ فیروز کے جانے کے بعد حکومت اس کے ہاتھ آ گئی۔ اس نے اپنے مطیع ہو جانے والے انبا کو کچھ نہ کہا، لیکن باقیوں کو عدن کی بندرگاہ یا خشکی کے راستے واپس خلیج فارس بھیج دیا۔ اقتدار سے محروم ہونے کے بعد فیروز نے اسلام پر قائم قبیلوں کو ساتھ ملا کر صنعا پر کامیاب حملہ کیا اور خلیفۂ اول کی طرف سے اپنی امارت پھر سنبھال لی۔ دار الحکومت سے باہر یمن ابھی پر سکون نہ ہوا تھا۔ بغاوت یمن کی تیسری وجہ یمن و حجاز کا دیرینہ عناد تھا۔ اسے زبید قبیلے کے عمرو بن معدی کرب نے خوب انگیخت کیا جو شاعر ہونے کے ساتھ جنگجو بھی تھا۔ اس نے قیس بن عبد یغوث کو اپنے ساتھ ملا لیا اور نجران کے عیسائیوں کے سوا تمام قبائل کو آمادۂ بغاوت کر لیا۔ اس اثنا میں عکرمہ یمن پہنچ چکے تھے، دوسری طرف سے مہاجر بن امیہ ابوبکر کا عطا کردہ علم تھامے پہنچ گئے، وہ مکہ، طائف اور نجران سے سینکڑوں جنگی لیاقت رکھنے والے افراد کو ساتھ لائے تھے۔ ادھر سے فروہ بن مسیک ان سے مل گئے۔ اللہ کی مدد ایسی آئی کہ قیس اور عمرو میں پھوٹ پڑ گئی اور عمرو مسلمانوں کے ساتھ آ ملے۔ انھوں نے قیس کو پکڑ کر مہاجر کے سامنے پیش کر دیا، مہاجر نے دونوں کو گرفتار کر کے ابوبکر کی خدمت میں بھیج دیا۔ ابوبکر نے داذویہ کے قصاص میں قیس کو قتل کرنا چاہا، لیکن کوئی شہادت نہ ملی، جبکہ عمرو نے مملکت اسلامیہ کا نیک شہری بن کر زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تو دونوں چھوٹ کر اپنے قبیلوں میں واپس پہنچ گئے۔ عمرو نے مسلمان ہونے کے بعد اسلام کے لیے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ ابوبکر نے اقتدار کی کشمکش میں یمنی عربوں کے مقابلے میں ایرانی نسل کے فیروز اور شہر کو اس لیے ترجیح دی کہ وہ قبول اسلام میں سبقت کرنے والے تھے مزید یہ کہ شہر بن باذان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تقرری حاصل کر چکے تھے۔

اسود عنسی نے دعواے نبوت کیا تو کندہ کے لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی دوران میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آپ کے مقرر کردہ کندہ کے عامل زیاد بن لبید نے اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے مسلمان قبائل کو ساتھ ملایا اور قبیلۂ عمرو بن ربیعہ پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے مردوں کو قتل کرنے کے بعد عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ واپسی میں وہ کندہ کے رئیس اشعث بن قیس کے قبیلے کے پاس سے گزرے تو عورتوں نے اشعث کو دہائی دی، تیری خالاؤں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔ باوجودیکہ اشعث آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر چکا تھا اور ابوبکر کی بہن ام فروہ سے اس کی منگنی ہو چکی تھی، اس موقع پر اس کی قبائلی عصبیت بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنی قوم کو بھڑکا کر زیاد کی فوج پر ہلا بول دیا اور اپنی عورتوں کو چھڑا لیا۔ جب اس نے کندہ اور حضر موت میں بغاوت کی آگ بھڑکانی شروع کی تو صنعا سے مہاجر اور عدن سے عکرمہ زیاد کی مدد کو پہنچ گئے۔ اشعث کو شکست

ہوئی تو وہ بھاگ کر قلعۂ نجیر میں بند ہو گیا۔ قلعے کے تین رستوں پر یہ تینوں مسلمان جرنیل بیٹھ گئے تو قلعہ کی رسد مکمل بند ہو گئی۔ بالآخر ۶ سو قلعہ بند اپنے پیشانی کے بال کاٹ کر قلعے سے نکلے اور مسلمانوں سے لڑنے کی کوشش کی، لیکن بھاری اسلامی فوج کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ تب اشعث کو اپنی جان بچانے کی سوجھی، اس نے اپنے ۱۹ اہل خانہ کی جاں بخشی کے بدلے قلعے کے دروازے کھول دیے، اپنا نام لکھنا وہ بھول گیا۔ مسلمانوں نے اندر داخل ہو کر لڑائی میں حصہ لینے والے ہر شخص کو قتل کر دیا اور ایک ہزار کے لگ بھگ عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ مال خمس اور قیدیوں کے ساتھ اشعث مدینے پہنچا تو ابوبکر نے اس کو قتل کرنا چاہا، اس نے اسلام پر قائم رہنے کا وعدہ کیا تو اس کی جان بچی اور ابوبکر کی بہن اس کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ۱۲ھ (۶۳۳ء) میں ردہ کی تحریک دبا دی گئی، صرف ربیعہ بن بجیر سے جنگ ۱۳ھ میں ہوئی۔

ظہور اسلام سے قبل عرب تجارتی اغراض سے ایران، عراق اور شام جاتے رہتے تھے۔ ان میں بہت سے نقل مکانی کر کے ان ممالک کے سرحدی اور صحرائی علاقوں میں بس چکے تھے۔ ان میں سے شام میں مقیم رومیوں میں گھل مل گئے، جبکہ عراق کی سرحدوں پر بسنے والے الگ تھلگ رہے۔ ایران میں خانہ جنگی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو لخمی آگے بڑھے اور انھوں نے دریائے فرات کے کنارے انبار اور حیرہ کے شہر آباد کر کے مملکت حیرہ کی بنیاد رکھی، اس مملکت میں وہ عرب بھی آباد ہوئے جو بخت نصر قیدی بنا کر عراق لایا تھا۔ تیسری صدی کے وسط میں جذیمۃ الابرش نے حیرہ سے عین التمر اور صحرائے شام تک کے علاقے پر قبضہ کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ شام کی سرحد پر آباد عرب قبیلے غسان کی سلطنت قائم تھی، چھٹی صدی میں اسے عروج حاصل ہوا۔ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کی حدود جنوب میں خلیج فارس اور خلیج عدن تک اور شمال میں موصل اور آرمینیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ عراق و شام ایران و روم کی کشمکش میں پس رہے تھے، کبھی ایرانی ان پر غالب آ جاتے کبھی رومی۔ ان دونوں بڑی طاقتوں (Super Powers) نے اپنی اپنی سرحدوں پر آباد عرب صحرانشینوں کو ڈھال (Buffer Zone) کے طور پر استعمال کیا تاکہ ان کا باہم جنگ و جدال ختم ہو۔ بعثت نبوی کے وقت بھی ان کی لڑائیاں جاری تھیں۔ آپ نے محسوس فرما لیا تھا کہ عرب قبائل میں امن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب قبائل حلقۂ اسلام میں آ جائیں، اس لیے آپ نے شام کو جانے والی شاہراہ پر لشکر کشی کی۔ اسی نکتے پر ابوبکر نے عمل کیا اور وہ اسامہ کا لشکر بھیجنے پر مصر رہے۔ خلافت ابوبکر کا پہلا سال مرتدین سے نمٹنے میں گزرا جب وہ اس میں کامیاب ہوئے تو ان بڑی طاقتوں (Super Powers) کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی پہلی توجہ روم پر تھی، کیونکہ روم پر حملے کا آغاز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں شرکت کر کے فرما چکے تھے پھر

ایران کی مسافت کچھ زیادہ تھی اور ایران سے ملحقہ قبائل میں ارتداد کا فتنہ ابھی ابھی فرو ہوا تھا۔ وہ اسی سوچ میں تھے کہ بکر بن وائل کے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی جو علا بن حضرمی کے ساتھ مل کر مرتدین سے جنگ کر چکے تھے، چند افراد کے ساتھ عراق پہنچے اور وہاں آباد عربوں کو ایران کی غلامی چھوڑ کر اسلامی حکومت کی حمایت کرنے پر آمادہ کیا۔ پھر وہ مدینہ آئے اور ابوبکر کو اطمینان دلایا کہ شام کے بجائے عراق کو فتح کرنا سہل تر ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایرانی حکام وہاں کے کسانوں کی ساری فصل لوٹ کر لے جاتے ہیں، اس لیے وہ ان کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ابوبکر فوج کشی پر تیار ہو گئے، لیکن انھوں نے مدینہ کے اہل رائے سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ شوریٰ کے فیصلے کے مطابق خالد بن ولید کو یمامہ سے بلایا گیا اور اس بارے میں ان کی رائے طلب کی گئی۔ انھوں نے ترت مشورہ دیا کہ اگر مثنیٰ کے پلان کے مطابق فوراً ایران میں پیش قدمی نہ کی گئی تو الٹا ایرانی بحرین اور ملحقہ علاقوں پر تسلط جمانے کی کوشش کر کے اسلامی خلافت کو غیر مستحکم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوبکر نے مثنیٰ کو عرب قبائل سے رابطے کرنے کے لیے واپس بھیجنے اور مدینہ سے جلد اسلامی لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دوسری روایات کے مطابق مثنیٰ مدینہ آئے نہ عراق پر یورش کی پیش بندی ہوئی، بلکہ مثنیٰ اکیلے ہی لشکر لے کر عراق میں گھس گئے اور جب ہرمز کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو ابوبکر نے خالد بن ولید اور عیاض بن غنم کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ انھوں نے غریب کاشت کاروں سے اچھا سلوک کرنے کی بطور خاص ہدایت کی۔ خالد کے ساتھ صرف ۲ ہزار سپاہی تھے، ان کے بیش تر ساتھی یمامہ کی جنگ میں کام آ چکے تھے۔ انھوں نے دارالخلافہ سے کمک مانگی تو ابوبکر نے فرد واحد قعقاع بن عمرو تمیمی کو بھیج دیا اور کہا: ''جس لشکر میں قعقاع شامل ہو، وہ شکست نہیں کھا سکتا۔'' انھوں نے ان مقامی افراد کو بھرتی کرنے کا حکم بھی بھیجا جو مرتد نہیں ہوئے اور مرتدین کے خلاف جنگوں میں شریک رہے۔ خالد نے مضر اور ربیعہ کے قبیلوں سے ۸ ہزار مسلمان اپنے لشکر میں شامل کیے اور عراق روانہ ہوئے، مثنیٰ کے ساتھ ۲ ہزار افراد پہلے سے تھے۔ خالد نے ہرمز پر حملہ کرنے سے پہلے وہاں کی حکومت ایران کے مقرر کردہ حاکم ہرمز کو خط لکھا: ''اسلام قبول کر لو یا ذمی بن کر اسلامی سلطنت میں شامل ہو جاؤ۔'' پھر انھوں نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کو الگ راستے سے حفیر پہنچنے کی ہدایت کی۔ ادھر ہرمز تیزی سے اپنی فوج لے کر حفیر پہنچا اور پانی پر ڈیرے ڈال دیے۔ فوجیں آمنے سامنے آئیں تو ہرمز نے خالد کو دوبدو مقابلے کے لیے للکارا، جب وہ آگے پہنچے تو ایک دستے نے ان پر حملہ کر دیا، لیکن قعقاع نے بروقت کارروائی کر کے خالد کو بچا لیا۔ اسی دوران میں خالد ہرمز کی گردن اڑا چکے تھے، سپہ سالار کی موت سے ایرانیوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ کثیر مال غنیمت کا پانچواں حصہ، ہرمز کی ایک لاکھ درہم مالیت کی ٹوپی اور ایک

ہاتھی خلیفۂ اول کی خدمت میں مدینہ بھیجے گئے۔اس جنگ کاظمہ میں ایک ایرانی شہزادی کا قلعہ بھی فتح ہوا۔

مطالعۂ مزید: الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)،الصدیق ابو بکر (محمد حسین ہیکل)،اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

افادات غامدی

اخذ وتحریر: معظم صفدر
نظر ثانی: منظور الحسن

[جناب جاوید احمد صاحب غامدی اپنے ہفتہ واردرس قرآن وحدیث کے بعد شرکا کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ان میں سے چند منتخب سوال وجواب تحریر میں منتقل کر کے پیش کیے جارہے ہیں۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن کا فہم ــــ آسان یا مشکل

سوال: اللہ تعالیٰ نے سورۂ قمر کی آیت ۳۲ میں قرآن مجید کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ 'وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ' (ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا)۔ جب یہ قرآن آسان ہے تو پھر وہ کیا مشکلات ہیں جن کو حل کرتے ہوئے مفسرین اور قرآن کے ماہرین نے ایک ایک سورہ پر ہزاروں صفحات لکھ دیے ہیں؟

جواب: قرآن مجید کے فہم کے دو پہلو ہیں۔ایک پہلو نصیحت کا ہے۔اس اعتبار سے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی آسان ترین کتاب ہے۔اس کا اگر اچھا ترجمہ ہی پڑھا جائے تو جس بنیادی چیز کی یہ یاددہانی کرانا چاہتی ہے، اسے یہ ہر پہلو سے واضح کر دیتی ہے۔ وہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خدا ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے اور انسانوں کو ایک دن اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔آپ قرآن کو جہاں سے کھولیے، وہ یہ بات بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل بجا ہے کہ نصیحت اور یاددہانی حاصل کرنے کے لیے قرآن دنیا کی آسان ترین کتاب ہے۔تاہم، اس ضمن میں واضح رہنا چاہیے کہ 'یسرنا' کا صحیح مفہوم ''آسان بنا دینا'' نہیں، بلکہ ''موزوں بنا دینا'' ہے۔یعنی ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے اور ظاہر ہے کہ موزونیت اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ اسے سمجھنے میں آدمی کو کوئی دشواری پیش نہ آئے، بلکہ وہ آسانی کے ساتھ اس کے مدعا تک پہنچ جائے۔

قرآن مجید کے فہم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ علماے اولین اور متاخرین کے لیے علمی اعتبار سے ہمیشہ محل تدبر رہا ہے۔ یہ ام القریٰ کی عربی معلیٰ میں نازل ہوا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو زبان وادب اور فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا اور قریش کو یہ چیلنج کیا کہ وہ اس کے مانند کوئی ایک سورہ ہی پیش کر دیں۔ یہ ایک منفرد اسلوب کا حامل ہے جسے نہ نثر کہا جاسکتا ہے اور نہ نظم۔ اس کا ایک پس منظر اور ایک پیش منظر ہے۔ اس میں خطاب لحظہ بہ لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ علما کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ کسی مقام پر مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عام انسان ہیں، قریش مکہ ہیں یا یہود و نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ اگر اس نوعیت کا فہم پیش نظر ہو تو یہ دنیا کی مشکل ترین کتاب ہے۔ مجھے خود زندگی میں بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ قرآن مجید کے ایک حصے کی برسوں تلاوت کی ہے، اس کو بار بار پڑھا ہے، وہ یاد بھی ہے، لیکن جب کوئی خاص مسئلہ پیش آیا اور اس پر غور کرنا شروع کیا تو اس کے ایسے پہلو نمایاں ہونے شروع ہو گئے جن کی طرف پہلے کبھی توجہ نہیں تھی۔ یہ قرآن مجید کا خاص کمال ہے۔ اس لحاظ سے اہل علم کبھی اس سے سیر نہیں ہوتے۔

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام آدمی اسے نصیحت اور یاددہانی کے لیے سمجھنا چاہے تو کوئی مشکل نہیں ہے اور اگر امت کی اعلیٰ ذہانتیں اس کو اپنا موضوع بنائیں اور اس میں ہزاروں لاکھوں لوگ بھی کھپ جائیں تو کبھی وہ اس کو یہ خیال کر کے ایک طرف نہیں رکھ سکتے کہ اب اسے ہر لحاظ سے سمجھ لیا گیا ہے۔ (جون ۲۰۰۴)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن کے ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں

سوال: ہمارے ہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھے بغیر پڑھنے سے بھی اجر و ثواب ملتا ہے۔ اس کے استدلال میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص 'الـم' پڑھتا ہے تو اس کے چونکہ تین حروف ہیں، اس لیے اسے تیس نیکیاں ملیں گی۔ کیا قرآن کو بے سوچے سمجھے پڑھنے سے ثواب ملتا ہے اور اگر نہیں ملتا تو پھر اس حدیث کی کیا وضاحت کی جاسکتی ہے؟

جواب: حدیث میں یہ بات ہرگز نہیں کہی گئی کہ سوچے سمجھے بغیر قرآن پڑھنے کا اجر ملتا ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ آدمی جب قرآن مجید پڑھتا ہے تو اس کے ہر حرف پر اس کو نیکی ملتی ہے۔ یعنی قرآن مجید کی آیت کا جو مدعا ہے، اس کو سامنے رکھ کر اس کی تلاوت کی جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بے سوچے سمجھے کہیں کہ الف تو آپ کو دس نیکیاں مل جائیں گی۔ قرآن مجید تو علم و عقل کو اپیل کرتا اور فکر و عمل کی راہوں کو متعین کرتا ہے۔ بے سوچے سمجھے پڑھنے

سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ (جون ۲۰۰۴)

قبولیت حدیث کی شرط

سوال: علامہ خطیب بغدادی کی تصنیف ''الکفایہ فی علم الروایہ'' فن حدیث کی امہات کتب میں سے ہے۔ اس میں انھوں نے قبولیت حدیث کے شرائط کے ضمن میں پہلی شرط یہ بیان کی ہے کہ حدیث عقل و فطرت کی کسوٹی پر پوری اترنی چاہیے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو، وہ سنت کے خلاف نہ ہو۔ میرا سوال یہ ہے کہ حدیث کا عقلی طور پر قابل قبول ہونا قرآن وسنت پر مقدم کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: علامہ خطیب بغدادی نے اس بات کو دو جگہ بیان کیا ہے۔ ایک جگہ اسی طرح سے بیان کیا اور دوسری جگہ قرآن کو مقدم کر کے بیان کیا ہے۔ یعنی دونوں طرح کے بیانات ہیں۔ تاہم جہاں عقل کو مقدم کر کے بیان کیا ہے وہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن مجید کی دعوت جس چیز پر مبنی ہے، وہ علم و عقل ہی ہے۔ علامہ خطیب بغدادی نے اگر کسی موقع پر اس چیز کو مقدم کر دیا ہے تو غلط نہیں کیا۔ اس لیے کہ پہلا فیصلہ تو عقل نے کرنا ہے کہ کوئی چیز فی الواقع علم و عقل کے مسلمات پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

البتہ، ایک چیز واضح رہنی چاہیے کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ حدیث عقل کے خلاف نہ ہو، بلکہ اصل میں یہ کہنا چاہیے کہ علم و عقل کے مسلمات کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک آدمی بالکل عامیانہ طریقے سے دو چار عقلی مقدمات قائم کرتا ہے اور کہتا ہے یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ علم و عقل کے مسلمات سے مراد یہ ہے کہ وہ بات علمی لحاظ سے بھی مسلمہ ہو اور عقلی لحاظ سے بھی۔ اگر اس کے خلاف کوئی روایت ہے تو پھر اس کو قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ (جون ۲۰۰۴)

شادی کے وقت سیدہ عائشہ کی عمر

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت سیدہ عائشہ کی عمر کیا تھی؟ کیا آپ ۶ یا ۹ سال کی تھیں جیسا کہ روایتوں میں بیان ہوا ہے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جواب: عربی زبان میں اعداد کو بولنے کا ایک الگ طریقہ ہے جو ہماری اردو میں اس طرح معروف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب قدر کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ پچیسویں، ستائیسویں یا انتیسویں تاریخ کو اس کے ہونے کا امکان ہے۔ یہاں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ پچیس یا ستائیس کا عدد ارشاد فرماتے۔ لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ چھٹی رات کے بعد، ساتویں رات کے بعد، نویں رات کے بعد۔ اب ان تاریخوں کے ساتھ یہ چیز مقدر مان لی گئی ہے کہ بیس کا عدد تو بولا ہی جا رہا ہے، جس سے مل کر یہ پچیس یا ستائیس یا انتیس تاریخ قرار پاتی ہے۔

بالکل اسی اسلوب میں ایک موقع پر جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی عمر بیان کی تو سولہ کا چھ رہ گیا اور انیس کا نو رہ گیا ہے۔ اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی اور عام شہرت بھی اسی بات کی ہوگئی۔ موجودہ زمانے میں بعض محققین نے اس پر بڑا وقیع کام کیا ہے اور اس بات کو دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جب سیدہ کی منگنی یا نکاح ہوا تو اس وقت وہ قریباً سولہ سال کی تھیں اور جب رخصتی ہوئی تو ان کی عمر انیس سال کے قریب تھی۔ (جون ۲۰۰۴)

امام مہدی کا نزول

سوال: قرآن و حدیث میں کیا کہیں امام مہدی کے نزول کا ذکر ملتا ہے؟

جواب: قرآن مجید میں نزول مہدی کے بارے میں اشارۃً بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح صحیح حدیثیں بھی اس طرح کے تذکرے سے یک سر خالی ہیں۔ البتہ، بعض دوسرے درجے کی ایسی روایات ملتی ہیں جن میں قیامت کے قریب اس طرح کی ایک شخصیت کے پیدا ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان میں بھی ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جو نہ علمی لحاظ سے درست ہو سکتی ہیں اور نہ عقلی لحاظ سے۔ میرا رجحان اس معاملے میں یہ ہے کہ یہ روایتیں درحقیقت اگر کچھ تھیں بھی تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تھیں۔ ان کے زمانے کے لوگوں نے اس کا مصداق پا لیا اور وہ تاریخ میں اپنا کام مکمل کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس موضوع پر بعض محققین نے بہت اچھی چیزیں اس زمانے میں لکھ دی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے جو مسلمانوں کے مابین افسوس ہے کہ بہت رائج کر دیا گیا اور اب امت مسلمہ اسی انتظار میں بیٹھی ہے کہ کوئی امام مہدی آئے گا اور ایک مرتبہ پھر ان کی خلافت دنیا میں قائم کر دے گا۔ (جون ۲۰۰۴)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تمدنی معاملات میں پیغمبر کی اتباع

سوال: حدیث میں ہم اخلاقی اور تمدنی، دونوں طرح کے معاملات کا ذکر دیکھتے ہیں۔ اخلاقی امور تو بلاشبہ ہمارے لیے قابل اتباع ہیں، لیکن کیا تمدن کے بارے میں اتباع لازم ہے؟ مزید یہ کہ اگر ہمارا تمدن انتہائی بگاڑ کا شکار ہو جائے تو کیا ہم دور نبوی کے تمدن کی پیروی کریں گے؟

جواب: اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ میں دین دینے کے لیے آیا ہوں، تمھیں میری اتباع دین ہی کے معاملے میں کرنی ہے، دنیا کے معاملات میں تم پر میری اتباع ہرگز لازم نہیں ہے۔

جہاں تک تمدن میں بگاڑ کا تعلق ہے تو ہر تمدن میں بگاڑ بھی ہوگا اور اچھی روایتیں بھی رہیں گی۔ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ سارے کا سارا تمدن بگاڑ کا شکار ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا ہے تو میرا خیال ہے کہ اس وقت قیامت آ جانی چاہیے۔ چونکہ دنیا میں خیر وشر کی کشمکش برپا ہے، اس لیے دونوں طرح کی روایتیں باقی رہیں گی۔ اس صورت حال میں کرنا یہ چاہیے کہ اپنے تمدن اور اپنی تہذیب میں سے اچھی باتیں اپنا لی جائیں اور بری باتوں کے بارے میں صرف نظر سے کام لیا جائے۔

رہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمدن کو اختیار کرنے کی تو اس میں اور موجودہ تمدن میں بہت زیادہ فرق واقع ہو چکا ہے۔ نہ اب وہ زندگی رہی ہے، نہ اس کے وہ لوازم رہے ہیں۔ تاہم قدیم تمدن کی کسی روایت سے اگر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو ضرور اٹھانا چاہیے۔ (جون ۲۰۰۴)

تنخواہ پر زکوٰۃ

سوال: تنخواہ بھی آمدن کا ایک ذریعہ ہے۔ کیا ایسی آمدن پر زکوٰۃ ہے، اگر ہے تو پھر اس کا نصاب کیا ہے اور کس حساب سے دی جائے گی؟

جواب: زکوٰۃ مال، مواشی اور پیداوار، تینوں پر ہے۔ قدیم زمانے میں زرعی پیداوار ہوتی تھی، لیکن بعد کے زمانوں میں پیداوار کی اور قسمیں سامنے آ گئیں۔ میرے نزدیک جو نئی صورتیں سامنے آئیں گی، ان کا ان تین میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کیا جائے گا۔ جیسے ہمارے فقہا کو یہ مسئلہ پیش آیا کہ بھینس چونکہ عرب میں نہیں پائی جاتی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تھی، اس لیے اس کی زکوٰۃ بیان نہیں ہوئی۔ جب یہ سوال سامنے آیا تو انھوں نے الحاق کا اصول اختیار کیا۔ پہلے یہ دیکھا کہ بھینس کو کس کے ساتھ ملایا جائے، اونٹ کے ساتھ، بکری کے ساتھ یا گائے کے ساتھ۔ انھوں نے گائے کے ساتھ ملا دیا۔ اسی طرح موجودہ دور میں صنعتی پیداوار کی جونئی صورتیں ہیں، ان کے بارے میں میرا اجتہاد یہ ہے کہ ان کو زرعی پیداوار کے ساتھ ملا دینا چاہیے اور ان پر وہی اصول لاگو کرنا چاہیے جو زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے ملنے سے پیداوار ہو تو اس پر پانچ فی صد زکوٰۃ ہو گی اور اگر ان میں سے کسی ایک سے ہو تو دس فی صد ہو گی۔

تنخواہوں کی آمدن کو میں مزروعات کے ساتھ ملحق کرتا ہوں اور اس لیے اس پر پیداوار کی زکوٰۃ عائد کرتا ہوں۔ یعنی میرے نزدیک اس پر زرعی پیداوار کی زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس کا نصاب کیا ہو گا تو یہ حکومت مقرر کرے گی، کیونکہ یہ اسٹیٹ کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانے میں انکم ٹیکس کے معاملے میں جب تک کوئی حکومت اسلامی طریقے کے مطابق نصاب کا اظہار نہیں کر دیتی، اس وقت تک حکومت نے جو نصاب مقرر کیا ہوا ہے، میرے نزدیک اسی نصاب کو اختیار کر لینا چاہیے۔ (جون ۲۰۰۴)

زم زم کا معنیٰ

سوال: زم زم کا کیا معنیٰ ہے؟

جواب: یہ قدیم زبان کا لفظ ہے۔ اس کا متعین معنیٰ تو کسی کو معلوم نہیں، البتہ اس کے بارے میں لوگوں نے قیاس کیا ہے کہ اس کا مطلب ''ٹھیر جا، ٹھیر جا'' ہے۔ لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ عربی زبان میں اس طرح کے بہت سے رباعی اسما ہیں جو ضروری نہیں ہے کہ زم زم کی طرح فعل امر کی شکل میں بیان ہوئے ہوں۔ اس لیے مشکل ہے کہ اس کے اشتقاق کے بارے میں کوئی رائے دی جا سکے۔ اہل لغت نے جتنے معنی بیان کیے ہیں، یہ محض قیاسات ہیں۔ اس ضمن میں میرا خیال یہ ہے کہ مان لیجیے کہ جیسے زمین کا نام ارض ہے اور آسمان کا نام سماء ہے، اسی طرح اس چشمے کا نام زم زم ہے۔ (جون ۲۰۰۴)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net